Regd. L. No. 7243

Phone 8802

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1983

اس پرچہ میں

اسلام کے مقابل اسلام

مرکز: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ "	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	جنوری ۱۹۸۳ء	شمارہ ۱

فہرست

۱۔ لمعات۔۔ (نذرِ عقیدت بدرگاہِ رسالت مآبؐ) ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳

۲۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰

۳۔ حقائق و عبر (۱) بنگلہ دیش کے صدارتی امیدوار متوجہ ہوں! (۲) یہ ہم کیا ہیں؟ (۳) بے پردہ خواتین کیلئے سزا۔ ۱۱
(۴) اصلاحِ معاشرہ کی مہم کی ناکامی (۵) دو سو پینسٹھ کن سونا!
(۶) کیا خدا نے انسان کو (معاذ اللہ) اپنی صورت پر پیدا کیا ہے؟
(۷) صدرِ مملکت کا تصورِ اسلام (۸) فی سبیل اللہ فساد!

۴۔ اسلام کے مقابل اسلام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷
یومِ پیدائش قائداعظمؒ کی تقریب پر پرویز صاحب کا خطاب ۔۔۔۔۔۔۔۔

۵۔ باب المراسلات (۱) مظلوم بچے (۲) عرس کا کیا مطلب ہے؟ (۳) تذکرۂ غوثیہ کی چند جھلکیاں ۴۱

۶۔ مثالی مملکت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹

۷۔ مطالب الفرقان ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر شیخ عبد الحمید مقام اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبک روڈ لاہور

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

لمعات

نذرانۂ عقیدت
بحضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم)

یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت، قرآن اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ کی آئینہ بردار ہوتی ہے، لیکن ربیع الاوّل کا مہینہ نوعِ انسان کے لئے جس خیر و برکت کا ضامن اور یمن و سعادت کا پیغام ہوتا ہے اس کے پیشِ نظر اس ماہ سے متعلق اشاعت میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے سلسلہ میں خصوصی نذرانۂ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی تجسس و کاوش کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ پرویز صاحب کی مایۂ ناز اور منفرد تصنیف، معراجِ انسانیت میں، گہر ہائے عقیدت انبار در انبار اور گل ہائے مدحت روش در روش موجود ہیں۔ ہم اُسی کفِ گل فروش و دامانِ باغباں کی خوشہ چینی سے چند بہ گہائے خوش رنگ پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

وہ آئے بزم میں ......

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و نا امید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پکار سُننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھی کہ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ؟ یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس ربِ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل

کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و شادابی پیدا ہو گئی۔ اعمال صالحہ کے خشک چشمے، حیات تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیم سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارکباد دی کہ تیرے بخت بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذروں کو اس ذات اقدس و اعظمؐ کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالم موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، ناسوت و لاہوت یہ اور وہ توامین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقام بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دائرۂ نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ نوامیس فطرت نے جنت سے نکالے ہوئے ابن آدمؑ کے اس طالع بیدار کا تقدیس و تمجید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا کے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغام فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا، نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلک ابراہیمی کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتاب عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا — إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا [illegible] وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ [illegible]

جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے طوق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس، طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است — سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن — جہانِ شوق را پروردگار است

إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا!

جب مشیتِ ایزدی کی تدبیر محکم جس کے سے زمین و آسمان یوں قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچی جب

انسانیت، جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں جتن دیئے تھے گہوارۂ طفولیت سے حریم شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے رازہائے درون پردہ کے معدن لعل و گہر کو اپنے اندر سمولے، تو آسمان کی حوریں زمین پہ اُتریں کہ جنّت کے پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ چمن گلستان کا ممات پہ بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرّتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنّیٓ اَعۡلَمُ مَالَا تَعۡلَمُوۡنَ کی تفسیر ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک، تعظیم کے لئے جُھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اُٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اُٹھے۔ بلد امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد تھی جس کی طرف جبل تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہ زیتون پہ حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہ تسکین خاطر بنایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طور سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیل اکبرؑ اور ذبیح اعظمؑ نے اپنے خُدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا، کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا، اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اُٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں　　تو صلوٰۃ صبح، تو بانگِ اذاں

مقامِ محمدیؐ

یہ آنے والا، رسول کافۃً للناس اور رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دُنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دُنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام پر بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اُتاری گئی۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں سجایا گیا۔

پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور انہی درخشندہ و تابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کمان کے ستائش گروں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے۔ یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو

ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است — رحمۃ للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر صاحبِ بصیرت پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰؐ رو

(٭)

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد — بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

قلب وادیٔ فاران، یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ، ہر عاکف و باد کے لئے مرکزِ قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زارِ حجاز کے ہر ذرّہ کی عقیدت حریمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے طفلک و برنا و پیر، نزد و دور، کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آ رہے ہیں جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز جذبہ ہائے تعبّد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر، سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے استھانوں پہ جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنجِ گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے دل کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے جذبِ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدانِ جنگ و جدل ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد، عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ کچھ ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔

لیکن مکہ کی ان پُر ہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریقِ احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب، جو اس کی قوم کا جزوِ زندگی بن چکے ہیں، اس کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجودِ رقصاں لے کر حریمِ کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہاں گھڑے تابندہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی جو کچھ ہیں اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتیں۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی خود تراشیدہ مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ —— یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو، ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے، لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے کردار کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کا قلبِ سلیم ابا کرتا ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں —— وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سُن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کون سی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن ان سے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رجوع کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اسے تلاش ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور ترکیب خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا ماجرا کہہ سکے۔

وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر   کہ من شاید نخستیں آدم از عالمے دیگر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے اور گاہ ماہ و عالمتاب کی درخشندگی سامانِ تدبر و تفحص پیدا کر دیتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آ گیا؟ کون اسے ایسی حسن و خوبی سے چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت پہلے سے تیز تر ہو جاتی ہے لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اس قدر ہے کہ وہ اس کی تپش

اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہداشت، رفقاء واحباب سے میل ملاقات، معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت واصابت پر ناز ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ جن کوششوں کو انہوں نے اپنے لئے وجہ اطمینان اور موجب تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو سراپا کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے؟ کارلائل کے الفاظ میں:۔

اور شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں:۔

میں کیا ہوں؟ کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہئے؟

صحرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملتا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنا لے۔

HEROES AND HERO-WORSHIP P.49

ہاں، ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت قبل از نبوت حضورؐ کی تھی۔

نبوت خالصۃً خدائی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے ملکہ یا کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا جس ذات کو اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا، اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقت معینہ پر نبوت عطا کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کو قبل از نبوت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ (حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا)۔

مقامِ نبوت

نبوت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبی کا پیغام انقلاب آفریں دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئین کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ اور آرزوئیں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے ابلتے ہیں۔ قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ امیدیں

کی کلیاں کھلتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا گلشن حیات دامانِ صد باغبان و کفِ گلفروش کا فردوس اپنا منظر پیش کرتا ہے۔ حکومت الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہا ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھوں خدائی بادشاہت کا تختِ جلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت پہاڑوں کے غاروں میں سر چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصر فلک بوس کے کنگرے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے رفقا کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے اس انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۔

قرآن و سیرت

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس کی تشریح و تبیین میں کتابوں پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن اگر اسے مجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمدنی اور معاشی زندگی یعنی ہیئت اجتماعیہ کو کس طرح ان مستقل اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطہ قوانین کی حیثیت سے کارگہِ ہستی کو اس نظم و ضبط، توازن و اعتدال اور حسن و رعنائی سے نہ صرف سرگرمِ عمل رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کے تعمیری پہلوؤں کو بروئے کار لا کر اسے تخلیقی ارتقاء کے مراحل طے کراتے ہوئے رواں دواں جانبِ منزل لئے جا رہی ہیں۔ قرآن میں اقوامِ قبل سابقہ کے احوال و کوائف اور حضرات انبیائے کرام کے تذکارِ جمیلہ سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنے تمدنی و معاشی نظام یعنی حیاتِ اجتماعیہ کو آفاقی قوانین سے الگ کر لیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی ان ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آ گیا جسے وہ فسادکی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے کاروانِ انسانیت، شرف و رفعت کی بلندیوں کی طرف جانے کی بجائے سبعیت و بہیمیت کی پستیوں کے جہنم میں جا گرا۔ اور اس کے برعکس، جب انہوں نے اپنی زمینی زندگی (حیاتِ ارضی) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کر لی تو کس طرح زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی اور عالم انفس و آفاق میں کس طرح شگفتگی و شادابی کی جنتیں لہلہا کر سامنے آ گئیں۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدت اختیار کر چکا تھا لیکن نوعِ انسانی کے محسنِ اعظمؐ اور آسمانی انقلاب کے اس داعی اکبرؐ کے تبلیغ کی مساعی و عمل سے انسانی نظامِ حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے۔ اور انسانیت نے اس فردوسِ گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم رنگ و کوثر نشاں دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرنہا قرن سے حیران و سرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرتِ محمدیہ درحقیقت عبارت و تاریخ ہے اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اس ذلت آمیز و کرب انگیز جہنم سے نکل کر جس میں اسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ عیاشیوں نے دھکیل رکھا تھا، بلندیوں اور ہمواریوں کی اس روح پرور اور نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمر باری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ۔ اس شجرِ طیب کی طرح جس کی جڑیں زمین میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی جنت در آغوش فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
		نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر - (بمقام)		227/229 ALUMROCK ROAD 38 38H,
اوسلو (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے شام (بمقام)		MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۳	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۱۲ ہارون چیمبرز - الطاف حسین روڈ نیو چالی - فون : ۲۳۸۸۲۸
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	۱- رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر (OPP: VIP. MAINGATE) (پشاور سٹیشن) بازار روڈ فون ۷۲۴۵۹ ۲- ہوٹل نعمت کدہ - یونیورسٹی روڈ - جہانگیر آباد -
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - اتفاق بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیّہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس - شہید روڈ (لیّہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب - واقع 23A-K-L کیہال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی / مکان نمبر ۴ - نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ - عثمانی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب -
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام -
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توفی روڈ - باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ : چوہدری مقبول شوکت - گلی روڈ - سول لائنز -
گجرات - ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر بمقام ۱۲۰/بی - بھمبر روڈ ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ		
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون : ۳۱۰۷۱)
چکسو تحصیل کبیروالا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام - مطب حکیم احمدالدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۷۴)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام میاں سرجری کلینک ۳/۲۳ چنیوٹ بازار ۲ (فون ۲۸۵۵۰)

حقائق و عبر

۱۔ کہاں سے نکلے کہاں جا پہنچے!

روزنامہ جنگ (کراچی) کی ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے جس میں حیرت و عبرت کی ہزار داستانیں مضمر ہیں:-

چاٹگام ۱۹ نومبر (ا م ن ا ف) بنگلہ دیش میں صدارتی انتخابات کی مہم عروج پر پہنچ گئی ہے عوامی لیگ کے صدارتی امیدوار ڈاکٹر کمال حسین کا چاٹگام میں زبردست خیر مقدم کیا گیا انہیں ہاتھی پر سوار کر کے پورے شہر میں گھمایا گیا۔ ڈاکٹر کمال حسین کے ہاتھی کے پیچھے دس ہاتھیوں پر عوامی لیگی کارکن سوار تھے جن کے ہاتھوں میں مرحوم شیخ مجیب الرحمان کی قد آور تصاویر تھیں۔ جلوس کے آگے ایک جیپ چل رہی تھی جس پر ڈاکٹر کمال حسین کا انتخابی نشان رکھا ہوا تھا۔ جلوس انتخابی نعرے لگاتا ہوا ایک مندر کے قریب پہنچا جہاں مندر کے پجاری کی طرف سے سونے کی ایک کشتی جس کی قیمت تقریباً دس لاکھ روپے ہوگی ڈاکٹر کمال حسین کو پیش کی گئی۔ اس موقع پر تالیوں کی گونج میں ڈاکٹر کمال مندر کے اندر گئے اور مورتیوں کے چرن میں پھول چڑھائے اس موقع پر مندر کے پجاری نے ان کی کامیابی کے لئے پرارتھنا کی۔ مندر یاترا کے بعد ڈاکٹر کمال نے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ صدر منتخب ہونے کے بعد اقلیتوں کی اقتصادی حالت بدل دیں گے۔

۲۔ یہودی کیا ہیں؟

یہودی قوم اس قدر پُراسرار واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنی اصل حقیقت، اپنے مقاصد، و عزائم حتیٰ کہ اپنے مذہب تک کو ہر غیر یہودی سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ مجلہ فکر و نظر (اسلام آباد) کی اکتوبر سنہ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں محترم سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ایک نہایت پُراز معلومات مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان تو تلمود ہے لیکن اس کے آخر میں انہوں نے اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کہ یہود قوم کے عزائم بلکہ مذہبی فرائض کیا ہیں ہم اس کا اقتباس مجلہ فکر و نظر کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں تاکہ قوم کو معلوم ہو جائے کہ ہمارا کن لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑا ہے اور قرآن کریم نے یہ تاکید کیوں کی تھی کہ ان سے دُور دُور رہو، اور انہیں کبھی اپنا ہم راز نہ بناؤ۔

"یہود کی کتاب تلمود جو دنیا کے سارے یہودیوں کا دینی و دنیاوی دستور ہے اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:-

۱۔ یہودی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام فرشتوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ یہود اللہ تعالیٰ سے وہی عنصری تعلق رکھتے ہیں جو کسی بیٹے کو اپنے باپ سے ہوتا ہے۔

۲۔ اگر یہود دنیا میں نہ ہوتے تو آفتاب طلوع نہ ہوتا اور نہ زمین پر کبھی مینہ برستا۔

۳۔ اللہ نے تمام انسانوں کے کمائے ہوئے مال و منال پر یہود کو تسلط و تصرف کا اختیار کامل دے دیا ہے۔

۴۔ جو یہودی نہیں ہے اس کا مال مال متروکہ کا حکم رکھتا ہے۔ یہودیوں کو یہ حق حاصل ہے جس طرح چاہیں اسے اپنے قبضہ میں لائیں اور جو تصرف چاہیں کریں۔ یہی حکم ان عورتوں کے لئے ہے جو نسلاً یہودیہ نہیں ہیں۔

۵۔ اللہ نے اپنی پسندیدہ نسل یہود کے اختیار میں تمام حیوانوں اور انسانوں کو دے دیا ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ یہود کو جانوروں کی دونوں قسموں کی ضرورت ہے۔ ایک تو وہ جانور جو بات چیت نہیں کیا کرتے مثلاً چوپائے، طیور، دوسرے وہ جانور جو بات چیت کرتے ہیں۔ اس قسم میں مشرق و مغرب کے تمام وہ لوگ داخل ہیں جو یہودی نسل کے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان سب کو ہمارے اختیار میں اس لئے دیا ہے کہ ہم ان سے جس طرح چاہیں اپنی خدمت لیں۔

۶۔ ہر یہودی کا یہ فرض ہے کہ غیر یہودیوں کے قبضہ میں کسی مال کے جانے کو روکے تاکہ دنیا کے ہر مال کی ملکیت صرف یہود کے لئے باقی رہے۔

۷۔ کسی یہودی کو اگر فائدہ پہنچ رہا ہو یا کسی غیر یہودی کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا اور دھوکہ فریب سے کام لینا نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

۸۔ کسی غیر یہودی کی سلامتی یا اس کی بہتری کے لئے کوئی تمنا اپنے دل میں ہرگز نہ آنے دو۔

۹۔ اگر کوئی آبادی تمہارے (اے یہودیو!) قبضہ میں آجائے تو وہاں کے تمام لوگوں کو قتل کر دو۔ تم کو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ اپنے پاس کوئی قیدی رکھو۔ عورت، مرد، بوڑھے، بچے سب قتل کر دیئے جائیں۔

۱۰۔ جس سرزمین پر یہودیوں کا قبضہ نہیں ہے وہ نجس و ناپاک ہے اس لئے کہ پاک و طاہر صرف یہودی ہوتے ہیں اور وہ سرزمین پاک ہوتی ہے جس پر یہودیوں کا قبضہ۔

ویسے تو کتاب تلمود کے مکمل صفحات جتنے اسی قسم کی عجیب و غریب ہدایات سے بھرے ہوئے ہیں اور یہودی علماء اس کے پابند ہیں اور ہیں لیکن صرف یہ دس اقتباسات ہی اس بات کے لئے کافی ہیں کہ امریکہ کے مشہور و معروف مصنف کار ہنری فورڈ نے جب مسیحی اقوام کے ہاتھوں یہودیوں کی تکالیف کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ:

"یہودیوں کے مصائب اور ان پر پڑنے والی آفتیں انسانیت کے خلاف ان کے جرائم اور اذیت کے خلاف ان کی چیرہ دستیوں کے انکشافات کا لازمی و طبعی نتیجہ تھیں"

تو ہنری فورڈ نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔

یہودی بڑے سخت قسم کے نسلی جنون میں مبتلا ہیں اور انتہائی رازداری کے ساتھ طویل منصوبہ بندی کر کے تلمود کے احکام کے بموجب عمل کرتے ہیں۔ ان کے صوبجات اور دوسرے جماعت ہائے غیر یہودیوں کے سلسلے اتنی سختی کے ساتھ بند اور پُراسرار ہوتے ہیں کہ برہمنوں کے مٹھ اور شوالے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ بڑی آسانی کے ساتھ بوقت ضرورت کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتے ہیں لیکن اپنے نسلی تعصب کو نہیں چھوڑتے بلکہ اور شدت کے ساتھ خفیہ طور پر تلمود کی ہدایات کے بموجب کام

کرتے رہتے ہیں مگر جب کہیں ان کے کرتوت ظاہر ہو جاتے ہیں تو انہیں انتقامی حرکتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے اور تاریخ کے صفحات اس پر شاہد ہیں کہ وہ کبھی دوسروں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکے۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں اپنے ہم وطنوں کے دشمن بنے رہے"

(۰)

۳۔ خواتین کے لئے

ہفت روزہ الاعتصام (مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۸۲ء) کے اداریہ کا حسب ذیل اقتباس نوٹ کرنے کے قابل ہے:۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ ملک میں خواتین میں بے پردگی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر مؤثر طور پر قابو پانے کے لئے ایک آرڈی ننس جاری کیا جائے اور جو خواتین اپنے گھروں سے برقعہ یا چادر اوڑھ کر جسم خاص طور پر چہرے اور سینہ کو ڈھانپے بغیر نکلیں، ان پر پابندی عائد کی جائے۔ اور ایسے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والی خواتین کے لئے مناسب سزا تجویز کی جائے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ سفارش چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سیکرٹریٹ کی جانب سے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی ہدایت کی روشنی میں اسلامی نظریاتی کونسل کو لکھے جانے والے ایک خط کے جواب میں کی ہے جس میں اسلامی نظریاتی کونسل سے اسلام میں خواتین کے لئے پردے کے احیاء کے بارے میں رائے طلب کی گئی تھی اور اس سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ پردے کی اہمیت اور اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں اقدامات تجویز کرے۔ (مشرق" لاہور ۱۰ نومبر)

(۰)

۴۔ اصلاحِ معاشرہ کی مہم

الاعتصام (بابت ۱۹/۲۶ نومبر ۱۹۸۲ء) کے اداریہ کا یہ اقتباس بھی توجہ طلب ہے:۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے کہا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے چلائی جانے والی اصلاحِ معاشرہ کی مہم بے اثر ثابت ہوئی ہے کیونکہ صرف وعظ و نصیحت سے معاشرے کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے مزید کہا اگر صاحب اقتدار لوگ ٹھیک ہو جائیں تو زیردست خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ قرآن نے ہر فرد کے لئے لازمی قرار دیا ہے کہ وہ پہلے اپنی ذات کی اصلاح کرے اور پھر اپنے زیردست کی اصلاح کرے۔ انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ جن لوگوں کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ کی مہم چلائی جا رہی ہے وہ خود اپنی سطح پر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جب عمل اور کردار میں مطابقت نہ ہو تو اس کی کامیابی کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں درست عمل کے لئے عقیدے کی درستی پر زور دیا۔

("نوائے وقت" لاہور ۔ ۱۳ نومبر ۱۹۸۲ء)

(۰)

۵۔ (۲۶۵) من سونا

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

۱۹۷۹ء کو سعودی حکومت نے خانہ کعبہ کے دروازے کی مرمت اور سونے کا کام ایک سعودی سالم نامی عربی کو سونپا۔ سالم کو ایک ایسے کاریگر کی تلاش تھی جو اس مقدس اور ذمہ دارانہ مذہبی فریضہ کو سرانجام دے سکے۔ اس تلاش میں انہوں نے ملک اظہر حسین کا انتخاب کیا۔ ملک اظہر نے بتایا کہ خانہ کعبہ کا دروازہ جو کہ "ملتزم" کہلاتا ہے اور اس کے اندر سیڑھیاں اور دوسرا دروازہ جو کہ سیڑھیاں چڑھ کر خانہ کعبہ کے اندر جاتا ہے جو غسل خانہ کعبہ اور غلاف خانہ کعبہ کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ اس پر تقریباً دو سو پینسٹھ کلو سونا چڑھایا گیا۔ اندر کی سیڑھیاں بھی سونے کی بنی ہوئی ہیں۔ جب کہ ملتزم پر سونے اور وہائٹ گولڈ کے نقش و نگار کا کام لیا گیا ہے۔

۶۔ حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مجلہ "اقبال ریویو" اقبال اکادمی پاکستان کا ترجمان ہے۔ اس کی اکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں ڈاکٹر محمد باقر کا ایک مقالہ (بزبان انگریزی) شائع ہوا ہے جس کا موضوع ہے ــــ مثالی معاشرہ کے متعلق اقبال کا تصور۔۔۔ اس میں کئی ایک نکات تنقید طلب ہیں لیکن ایک ایسا ہے جس سے ہماری روح میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ اِنْسَانَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ

خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اس کا مطلب واضح ہے کہ خدا کی ایک "صورت" ہے جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ صورت (FORM) یا (SHAPE) کو کہتے ہیں جو صرف مادی اشیاء کی ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی کوئی صورت (FORM) ہے اسے مادی پیکر میں ڈھال دینے کے مترادف ہے۔ اور وہ صورت وہی ہے جو انسان کی شکل و صورت ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم جسے تسلیم ہے: اس کا ایک زاویہ (درحقیقت بنیادی) گوشہ یہ بھی ہے کہ اس نے خدا کا ایسا منزہ اور مبرّیٰ تصور پیش کیا ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں ملتا۔ دنیا کا کوئی مذہب (یا مذہبی کتاب) لیجئے اس میں خدا کے تصور میں کسی نہ کسی انداز سے مادی آلائش ضرور ملے گی۔ یہ صرف قرآن کا عطا کردہ منفرد تصور ہے، جس میں مادیت کا شائبہ تک نہیں۔ یہ کہنا کہ خدا کی کوئی صورت بھی ہے، اسلام کی بنیادی انفرادیت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر اسے عام مذاہب کی سطح پر کھڑا کر دینا ہے۔ قرآن جس خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے وہ اس تصور کا خدا ہے جسے اس نے خود پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ تصور کسی اور جگہ نہیں ملتا اس لئے وہ ان اہل مذاہب (یہود، نصاریٰ وغیرہ) سے بھی خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے جو (اپنے طور پر) خدا کو مانتے ہیں۔ ایسے خدا کو ماننا جس کی شکل و صورت بھی ہو، قرآنی خدا سے انکار کے مترادف ہے۔ مادی آلائش والا خدا ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے کیونکہ انسانی ذہن، مادہ سے ماوراء کسی شے کا تصور نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ تھی جو قرآن نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (۶/۱۰۰)۔ ذہن انسانی جو کچھ خدا کے متعلق سوچ سکتا اور اس کی طرف منسوب کر سکتا ہے، وہ اس سے بلند و بالا اور منزہ و مبرّیٰ ہے۔

ہم محترم مقالہ نگار کی خدمت میں عرض کریں گے کہ جس بات کو انہوں نے حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا ہے وہ تورات کا بیان ہے۔ تورات (عہدنامہ عتیق) باب اول۔ آیت ۲۷ میں ہے :۔

اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

ہمارے قصہ خواں واعظ تو اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن جب ہمارے ارباب علم و دانش کی علمی یہ کیفیت ہو تو سوچئے کہ قوم، حقیقت اور صداقت کو تلاش کرنے کے لئے کہاں جائے گی؟

ڈاکٹر باقر صاحب نے اس فقرہ کا (انگریزی زبان میں) ترجمہ یوں کیا ہے

GOD CREATED MAN IN HIS OWN LIKENESS

ہم ان کی معلومات کے لئے عرض کر دیں کہ یہ ترجمہ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲/۱۱)۔ خدا کی مثل کوئی شے نہیں۔ مارماڈیوک پکتھال نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

NAUGHT IS AS HIS LIKENESS

خدا تو اپنی (LIKENESS) کا اس طرح انکار کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب انسان کو اس کی (LIKENESS) قرار دیتے ہیں۔

ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اپنی طرف سے جو جی میں آئے کہتے رہیں لیکن انہیں کسی بات کو حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ بارگاہ ہے

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر　　　نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

اور ان کے ساتھ ہم اقبال اکادمی کے ارباب بست و کشاد سے بھی عرض کریں گے کہ وہ اقبال ریویو میں جو کچھ شائع کریں اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا کریں؛

لیکن ہم اقبال اکادمی کے کون سے ارباب بست و کشاد کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کریں؟ ڈاکٹر باقر صاحب تو خود اس کے چیئرمین ہیں!!

۷۔ چہ خوش!

امریکہ سے شائع ہونے والے جریدہ ٹائم نے اپنی ۳۰ دسمبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں صدر پاکستان کے اس انٹرویو کے اقتباسات دیئے ہیں جو انہوں نے اس جریدہ کے نمائندہ متعینہ نئی دہلی کو اوائل دسمبر میں دیا تھا۔ اس کا، احیاء اسلام سے متعلق اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔ صدر پاکستان نے فرمایا :۔

مختلف احوال میں احیاء اسلام کا مفہوم مختلف ہوتا ہے۔ اسلامی تنڈامینٹلزم کا جو مفہوم بعض اوقات مغرب میں لیا جاتا ہے، اسے براہ کرم مذہبی جنون، ضد اور تعصب، اور جمود و تنگ نظری سے مخلوط نہ کیجئے۔ پاکستان میں ہمیں اس کا احساس ہے کہ اسلام میں ایسی لچک ہونی چاہیئے جس سے وہ عصر حاضر کے تقاضوں اور زندگی کے مطالبات کو پورا کر سکے۔ یہ اسلامی تحریک تھی جس سے یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو ہم بھی ہندوستان کا ایک حصہ ہوتے۔ ہم اس نظریہ حیات کے احیاء سے بیگانہ نہیں جو تخلیق پاکستان کا موجب تھا۔ لہٰذا پاکستان میں اب تھیاکریسی نہیں

پائیں گے۔ ہم معاشرہ کی اخلاقی اقدار کا احیاء، انقلاب کے ذریعے نہیں ارتقاء کی رُو سے کرنا چاہتے ہیں۔

۸۔ سیرتِ رسولِ امینؐ کے آئینہ بردار!

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۷ دسمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے :-

مدرسہ جامعہ حنفیہ قاسمیہ گلبرگ میں آج کا لعدم جمیعت علماء اسلام کے دو دھڑوں کے درمیان اس وقت تصادم ہو گیا جب وہاں ایک روزہ سیرت النبیؐ کانفرنس کی کارروائی جاری تھی۔ اس موقعہ پر وہاں زبردست ہنگامہ آرائی ہوئی اور ایک گروپ نے مخالف فریق پر چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ماریں۔ اس کارروائی کے دوران علامہ اختر کاشمیری کو بُری طرح زد و کوب کیا گیا جس کے باعث وہ بیہوش ہو گئے۔ اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے مسلح پولیس کی بھاری جمعیت وہاں پہنچ گئی اور انہوں نے مدرسہ کو گھیرے میں لے لیا۔ گلبرگ پولیس نے مولانا احسان اللہ فاروقی، ان کے بیٹے، برادر نسبتی عنایت، مسجد کے امام اور دیگر نامعلوم افراد کے خلاف قاتلانہ حملہ، قتل کر دینے کی دھمکیاں دینے، ہنگامہ آرائی کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا ہے ..... علامہ اختر کاشمیری نے (جن کی رپورٹ پر مقدمہ درج کیا گیا ہے) کہا کہ مولانا فاروقی نے مجھ پر کلہاڑیوں سے وار کیا مگر میرے ساتھیوں نے کلہاڑی کا دستہ پکڑ لیا۔ اس دوران ان افراد نے مجھے لاتوں اور مکوں سے بُری طرح زد و کوب کیا۔ اس دوران میں میری جناح کیپ، گھڑی، پن اور نقدی جس کی مالیت تقریباً پانچ ہزار ہے، اُڑا لی گئی اور میری آنکھوں کا چشمہ بھی ٹوٹ گیا۔

اقبالؒ نے کہا تھا ——— کار مُلّا فی سبیل اللہ فساد!

"فی سبیل اللہ فساد" کی اس سے بہتر تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ:
دارالعلوم ۔ علمائے کرام ۔ سیرت کانفرنس ۔ اور فساد!

اِسے یاد رکھیئے!

(۱) منی آرڈر فارم کے نیچے اور اس کی پشت پر، آپ اپنا نام اور پورا پتہ ضرور لکھیئے اور اس طرح لکھیئے کہ وہ آسانی سے پڑھا جا سکے۔ اس سے ہمیں حساب رکھنے میں آسانی ہو گی اور آپ کے حساب میں کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہو گی۔

(۲) کسی ماہ کا پرچہ نہ ملنے پر، سارا غصّہ ادارہ طلوعِ اسلام پر نہ نکالا کریں۔ آپ کے اور ادارہ کے درمیان ایک اور کڑی بھی ہے اور وہ ہے ڈاک خانے کا نظام۔ یہاں سے ہر پرچہ چیک کر کے انتہائی احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ ادارہ اتنا ہی کر سکتا ہے۔ متعلقہ ماہ کی ۱۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو ادارہ کی طرف اطلاع دیدیں۔ پرچہ (بشرطِ موجودگی) آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ شکریہ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!

اسلام کے مقابل اسلام

قائدِ اعظم کے یومِ پیدائش کی تقریب،
منعقدہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۲ء پر
پرویز صاحب کا خصوصی درس

باسمہ تعالےٰ

اسلام کے مقابل اسلام!

(پرویز)

غالب نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ـــــ قدرِ شعرِ من بگیتی، بعدِ من خواہد شدن ـــــ دنیا میں میرے شعر کی قدر میرے بعد ہوگی ـــــ اقبالؔ نے بھی اسی احساس کا اظہار کیا تھا جب کہا تھا کہ ـــــ من نوائے شاعرِ فرداستم۔ میں آنے والے شاعر کی آواز ہوں۔ میرا زمانہ میرے بعد آئے گا۔" میں اپنے آپ کو ان اربابِ فکر و بصیرت کے زمرے میں شمار کرنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا، لیکن اس حقیقت کے اظہار سے باز بھی نہیں رہ سکتا کہ جو کچھ میں اسلام کے متعلق کہہ رہا ہوں وہ آنے والے مؤرخ کے لئے یادداشت کا کام دے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جب یہاں اسلام پر یہ کچھ بیت رہی تھی تو ایک گوشے سے قرآن کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔ قرآن کریم نے اپنے اوّلین مخاطبین (کفار) کے متعلق کہا تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لوگوں سے کہتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ اس قرآن کی آواز اپنے کانوں میں نہ پڑنے دو۔ وَالْغَوْا فِيْهِ ۔ اور اس قدر شور مچاؤ کہ دوسرے بھی اسے سُننے نہ پائیں۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (۴۱/۲۶)۔ بس یہی ایک طریق جس سے تم قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر غالب آ سکو گے۔ اگر لوگوں نے اس کی آواز سن لی تو پھر وہ تمہارے قابو نہیں آسکیں گے۔ یہی ٹیکنیک ہمارے زمانے کے اس ہجوم نے اختیار کر رکھی ہے جو نہیں چاہتے کہ قرآن کی آواز بلند ہونے پائے۔ قرنِ اوّل کے معاندین کے مقابلہ میں ان کے پاس پراپیگنڈہ کے بڑے وسیع اور شدید الاثر ذرائع ہیں۔ عوام ویسے ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ اس پراپیگنڈہ نے ان کے جذبات کو اس قدر دو آتشہ بنا دیا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آتش گیر مادہ بن جاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے دانشور طبقہ کا تعلق ہے، جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے وہ مذہب کے نام سے متنفر یا کم از کم (DISINTERESTED) ہو چکے ہیں۔ میرے زمانۂ ملازمت کی بات ہے۔ دفتر میں ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ تھا اور اس کے سیکشن میں ایک "احمدی" کلرک۔ "احمدیوں" کا تو یہ معمول ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک تک اپنا لٹریچر پہنچاتے ہیں۔ ایک دن اس کلرک نے اپنا کچھ لٹریچر اس سپرنٹنڈنٹ کو دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ لٹریچر کس موضوع سے متعلق ہے؟ اس نے کہا کہ یہ مذہب سے متعلق ہے۔ اُس نے وہ کاغذات اس کی طرف لوٹا دیئے اور کہا کہ انہیں گرجا کے پادری کے پاس لے جاؤ، اسے اس کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے نہیں۔ ہمارے دانشور طبقہ کی حالت کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ایک ایسا (SUBJECT) ہے جس کا تعلق مولوی صاحبان سے ہے۔ ان سے اُس کا کچھ واسطہ نہیں

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس، مسٹر جسٹس آفتاب حسین نے اس بارے میں گلہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے علما اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے وفاقی شرعی عدالت سے تعاون کریں۔ انہوں نے کہا کہ

> انہوں نے بارہا اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے تھے کہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں وکلاء اور علماء حضرات نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ علماء زبانی کلامی تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عملاً انہوں نے تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وفاقی شرعی عدالت کی دعوت پر چند علماء نے کچھ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں اپنی آراء بھیجی تھیں لیکن انہوں نے اپنی اس رائے میں صرف فقہ کو تحریر کر دیا تھا اور اکثر جگہوں پر قرآن اور حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس لئے ان کی آراء ہماری مناسب مدد نہیں کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ وکلا بغیر فیس کے کوئی مشورہ نہیں دیتے۔ اس لئے وکلا نے وفاقی شرعی عدالت سے بھی قابلِ ذکر تعاون نہیں کیا۔
>
> (روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۸۲ء)

یہ اس طبقہ کا حال ہے جس کا براہ راست تعلق مذہب اور قوانین سے ہے۔ اس سے مذہب کے ساتھ دلچسپی کے متعلق دیگر طبقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان حالات آپ سوچئے کہ قرآن کی جو آواز میں بلند کر رہا ہوں اس پر کون کان دھرے گا؟ عوام سے کب دیا گیا ہے کہ یہ کفر ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے۔ اس کے قریب تک نہ جانا؛ خواص نفسِ مذہب ہی سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ میں اس آواز کو بلند کئے جا رہا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے اسے اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس عمومی احوال کے باوجود، ایسے سعادت مند حضرات موجود ہیں جو اس آواز میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور تیسرے اس لئے کہ میری یہ آواز ریکارڈ میں رہے تاکہ آنے والا مؤرخ اس سے استفادہ کر سکے۔ (ورنہ) جہاں تک قرآن کے ساتھ اس دور کا عمومی تعلق ہے، اس کی حالت ایسی ہو چکی ہے جس کا اقبال نے ان حقیقت افروز لیکن نہایت حسرت انگیز الفاظ میں اظہار کیا تھا کہ ——

خوابم تہ یاد رفتہ و تعبیرم آرزو ست ——— میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ تو بھول گیا ہے لیکن میں یہ آرزو دل میں لئے بیٹھا ہوں کہ اس کی تعبیر میرے سامنے آ جائے۔

اقبال کا خواب

اقبال نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین (نظامِ حیات) حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسان کو عطا فرمایا تھا اور جسے آپ نے عملاً نافذ کر کے دکھا دیا تھا، اسے پھر سے زندہ حقیقت بنا کر دنیا کو بتا دینا چاہئے کہ یہ ہے وہ فردوس بریں جسے بنی آدم نے گم کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ جو اسلام، مسلمانوں کے مختلف ممالک میں رائج چلا آ رہا ہے، وہ دین نہیں جو صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا۔ یہ وہ مذہب ہے جو صدرِ اوّل کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ حقیقی دین کے احیاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا خطۂ زمین ہو جس میں پہلے سے کوئی نظامِ حیات ثبت نہ ہو۔ اس میں قرآن کی بنیادوں پر اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اس خطۂ زمین کے حصول کو قوم کے سامنے بطور نصب العین رکھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

> اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ اُن اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے

نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے ۔

(خطبۂ صدارت ۔ الٰہ آباد)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے "خطباتِ تشکیلِ جدید" میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں کہا تھا :۔

> اندریں حالات ہمارے لئے کشاد کار کی ایک ہی راہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور دُرشت تہیں جم گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے ، انہیں کھُرچ کھُرچ کر الگ کر دیا جائے ، اور حُرّیت ، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی ، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو ۔ (چھٹا خطبہ)

وہ جانتے تھے کہ اس اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی ۔ کیونکہ مذہب ان کے لئے ذریعۂ معاش بن چکا ہے ، اور جب حکومت کے ساتھ ان کی سازباز ہو جائے تو یہ ذریعۂ معاش ہی نہیں رہتا ، وجۂ حصولِ اقتدار بھی بن جاتا ہے ۔ اس کے برعکس حقیقی اسلام میں اس انسٹی ٹیوشن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا ۔ آپ کلامِ اقبالؒ کو شروع سے آخیر تک دیکھ جائیے ۔ اس میں آپ کو مُلّا کی مخالفت بہ شد و مد ملے گی ۔ وہ ان کے وجود کو مسلمانوں کی تباہی کا اوّلین سبب قرار دیتے ہیں ۔ وہ مسلمان سے واضح طور پر کہتے ہیں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

اپنے کلام کے علاوہ ، وہ دیگر مقامات پر بھی اسی خطرہ کو دُہراتے رہے ۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس (منعقدہ مارچ ۱۹۳۲ء) میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا :۔

مُلّاریت کے خلاف

> ہمارے دین کی یہ بلند فطرتی مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے ، اور آزادی چاہتی ہے ۔ روحانی اعتبار سے ہم جذبات اور حالات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں ۔ جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے ۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ نوجوانوں کو ان اقتصادی ، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے ۔

انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس نئی مملکت کے نظام کی بنیاد قرآن خالص ہوگی ۔ اور چونکہ ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ بڑی مخالفت ہوگی اس لئے ان کا مقابلہ کرنا بڑی جرأت طلب اور صبر آزما مہم ہوگی ۔ انہوں نے اپنے خطبات میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

> یہ سوال زُود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں ۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دُنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر بڑھے ۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حُرّیت پسند قلب ہے جسے رسول اللہ ؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ جانتے تھے کہ جس نظام کی بنیاد قرآنِ خالص پر ہوگی وہ دنیا کے ہر غیر قرآنی نظام کا مخالف ہوگا۔ اس میں ہر قسم کی شخصی حکومت کی مخالفت ہوگی خواہ وہ ملوکیت ہو یا آمریت حتیٰ کہ مغرب کی جمہوریت بھی۔ اس میں مغرب کی استعماریت کی بھی مخالفت ہوگی۔ اور وطن اور نسل کی بنیادوں پر نیشنلزم کی بھی۔ اس میں نہ مغرب کا نظام سرمایہ داری بار پا سکے گا نہ ہی روس کا اشتراکی نظام۔

ہر طرف سے مخالفت

اس اعتبار سے اس جدید مملکت کی مخالفت مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت ہی کی طرف سے نہیں ہوگی۔ بلکہ دنیا کی ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔ بنا بریں انہیں اس کا احساس تھا کہ اس مملکت کے قیام اور استحکام کی مخالفت ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔ کوئی قوم بھی اسے برداشت نہیں کر سکے گی کہ یہ نظام دنیا کے کسی خطے میں بھی قائم ہو جائے۔ چنانچہ کلامِ اقبال میں اقوامِ مغرب اور تہذیبِ مغرب کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے (اور اس تکرار و اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے)، اس سے مقصود قرآنی مسلمانوں کو متنبہ (WARN) کرنا تھا کہ تمہاری اس سکیم کی مخالفت تمام دنیا کی طرف سے ہوگی۔

قائد اعظم

اقبال یہ کہتا ہوا دنیا سے چلا گیا تو اس کے بعد قائد اعظمؒ اس پکار کو لے کر آگے بڑھے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ اس مملکت میں اندازِ حکومت کس قسم کا ہوگا۔ فرمایا کہ یہ اسلامی مملکت ہوگی اور

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔
>
> (انٹرویو حیدر آباد دکن۔ شائع شدہ روزنامہ انقلاب۔ لاہور۔ مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۲ء)

انہوں نے بھی اقبال کے تتبع میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ اس مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوانوں سے کہا تھا کہ

> مسلم لیگ نے (کم از کم) ایک کام تو کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے۔ . . . اس نے تمہیں اس ناخوش آئند طبقہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۰۰)

انہوں نے مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی (۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء) میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (طلوع اسلام ستمبر ۱۹۵۸ء)

انہوں نے قیام پاکستان کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا کہ

تھیاکریسی نہیں ہوگی

پاکستان میں کسی قسم کی تھیاکریسی نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے، اور نہ ہی قائداعظم کی کوئی معیاری سوانح حیات، اس لئے یہ چیز قوم کے سامنے آئی ہی نہیں کہ تحریکِ پاکستان میں متصادم محاذ کون کون سے تھے اور ان میں وجۂ نزاع اور بنادِ مخالفت کیا تھی۔ یہ متصادم محاذ تھے مذہبی پیشوا، اور اقبالؒ اور قائداعظمؒ اور بنادِ مخاصمت تھی اسلام کا وہ تصور جسے علماء پیش کرتے تھے، اور اس کے برعکس وہ تصور جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیشِ نظر تھا۔ یہ جنگ تھی درحقیقت اسلام کے دو تصورات کے درمیان۔ — ایک وہ اسلام جو کتاب اللہ پہ مبنی تھا۔ دوسرا وہ اسلام جو ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ تھا اور جس کے علمبردار ہمارے علماء تھے، اور ان کے ہم نوا وہاں کے ہندو۔ ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر قرآنی نظام ان کی دیوار بہ دیوار مملکت (پاکستان) میں قائم ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر وہاں کی (مسلم اور غیر مسلم) آبادی حکومت کو پیچھے سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ اس لئے وہ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مملکتِ پاکستان میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام کارفرما ہو جائے۔ آپ دیکھئے کہ وہاں یہ ہر دو تصورات کس طرح ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ (چونکہ اس جنگ کی ابتدا ہندوستان کی سرزمین سے ہوئی تھی اس لئے ہم اس کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اقوامِ مغرب نے اس جنگ میں کیا رول ادا کیا ہے۔ اور ابھی تک کر رہی ہیں)

علماء کا اسلام

ہندوستان میں علماء کا مسلک یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو شخصی قوانین — نکاح، طلاق وغیرہ کی آزادی ہو، تو حکومت خواہ سیکولر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ (ان علماء کے سرخیل) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ

> ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔
>
> (زمزم، ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

اس اسلام نے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ مولانا مذکور کے ارشاد کے مطابق:-

> کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ (مولانا مدنی کا پمفلٹ "متحدہ قومیت اور اسلام" ص ۶۱، جسے انہوں نے علامہ اقبالؒ کے جواب میں شائع کیا تھا)

یہ تھا اسلام کا وہ تصور جسے علماء کرام پیش کرتے تھے اور جس کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ اس کے برعکس داعیانِ پاکستان کے پیش کردہ اسلام کا تصور یہ تھا کہ اسلام کو اسی صورت میں آزاد تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کا نفاذ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں ہو۔ اسلام میں مملکت کی بنیاد ہی دین پر استوار ہوتی ہے۔ اس تصور کے اسلام کے متعلق ہندو کا ردِ عمل کیا تھا، اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اوائل ۱۹۴۳ء میں جب مملکتِ پاکستان کا مقصود و مطلوب ابھر کر سامنے آ گیا تھا، کانگریس کے (اس زمانے کے) مشہور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں تقریر

میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، قائد اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کریں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۹۳۸ء - ۶ - ۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۹۳۹ء - ۱۱ - ۱۴)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا :۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوں تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم! میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے ..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن - ۱۹۴۶ء - ۱۲ - ۹)

جب مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی، تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مسٹر گاندھی نے کہا تھا :۔

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کروں جس کا اس نازک وقت میں، ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز، ۱۹۴۰ء - ۴ - ۷)

اس کے دو ہی ماہ بعد مسٹر گاندھی نے پھر کہا کہ

اگر مذہب کو علیحدہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک فرد کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں۔ اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز، ۱۹۴۰ء - ۶ - ۲۹)

یکم نومبر ۱۹۵۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:-

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ انہیں معلوم تو کر لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنائیں جہاں طرزِ حکومت، قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے، مختصراً یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون، ۲-۱۱-۱۹۵۱ء)

یہ کچھ ہندوؤں نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا۔ تقسیمِ ہند کے بعد بھی یہ شعلہ ان کے سینے میں برابر بھڑکتا رہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وہاں کے مشہور اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:-

> پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے (اسی مقالہ افتتاحیہ میں) کہا کہ

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُر امن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوش گوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز، ۲۸-۱۰-۴۹ء)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ

> تقسیمِ ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی سٹیٹ ہوگا۔ . . . چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ہندو اس اسلام کے تو تحفظ کی ضمانت دیتا تھا جسے علماء پیش کرتے تھے لیکن اس اسلام کے تصور تک سے اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے جس کے نفاذ کے لئے مملکتِ پاکستان (کا پہلے مطالبہ کیا گیا تھا اور بعد میں یہ) وجود میں آگئی تھی۔ اس قسم کی مملکت کی مخالفت میں ہندو کس حد تک جانے کی سوچ رہا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب تقسیمِ ہند کا فیصلہ ہو گیا تو کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(PAKISTAN FACES INDIA — P. 99)

اسے پھر ذہن میں رکھئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہندو کو مسلمانوں کی ایک الگ مملکت بنانے پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا۔ انہیں اعتراض تھا تو اس پر کہ وہ مملکت (اقبال اور جناح کے تصور کے) اسلام کے نفاذ کا ذریعہ ہوگی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں عبرت آموز شکست کھانے کے بعد اُس زمانے کے (ہندوستان کے) وزیر دفاع مسٹر چوہان نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا تھا اور وہاں کی پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مسز گاندھی نے جو کچھ کہا تھا وہ ہندو ذہنیت کی پوری پوری غمازی کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

یہ (مسز گاندھی کے بقول) باطل نظریہ کیا تھا؟ یہی کہ مملکت کی بنیاد (اقبال اور جناح کے تصور کے) اسلام پر رکھی جائے گی۔

مرحوم مودودی صاحب کی طرف سے مخالفت

مطالبۂ پاکستان کی سب سے زیادہ شدید مخالفت سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں گزشتہ تیس پینتیس سال میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ (طلوعِ اسلام نے تو بلکہ ۱۹۴۱ء میں ان کی مخالفت کی تھی)۔ ان کا اندازِ مخالفت، نیشنلسٹ علماء سے مختلف تھا لیکن اقبال اور جناح کے پیش کردہ اسلام کو وہ بھی "کافرانہ" قرار دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تالیف۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ـــ حصہ سوم ـــ میں لکھا تھا:۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام رائج ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی ـــ ان کا گمان

غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔ (ص ۱۳۱ تا ۱۳۲)۔

انھوں نے اپنی مخالفت، تقسیم ہند کے زمانے تک برابر جاری رکھی، حتیٰ کہ انھوں نے اپریل ۱۹۴۷ء میں (جب تقسیم ہند کا اصولی فیصلہ ہو چکا تھا) تا اینکہ مدراس اور پٹنہ میں اپنی جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے تاکہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبہ پاکستان کے خلاف بھڑکایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت بھی تحریک پاکستان کو "غیر اسلامی" قرار دیا، اور (ان کے ایک رفیق کار) ملک نصراللہ خان عزیز (مرحوم) نے یہاں تک کہہ دیا کہ

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھ دار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں۔ جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیۃً نابلد ہیں اور بعض ادھر ادھر سے چند باتیں اور نعرے سن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی سمجھ دار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خوفِ خدا سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعات زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایسی مضبوط اور منظم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریہ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مر مٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہوگی وہیں وہ اس نظریہ کی حکومت قائم کر لے گی۔ (روداد جماعت اسلامی، حصہ پنجم۔ ص ۱۶۵ تا ص ۱۶۶)۔

یعنی ان کے نزدیک بھی، اسلام کے نفاذ کے لئے الگ خطۂ زمین کی ضرورت نہیں تھی یہی بات نیشنلسٹ علماء کہتے تھے اور ہندو بھی یہی چاہتا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران بنیادی وجۂ نزاع کیا تھی؟ یہ درحقیقت اسلام کے دو تصورات کا ٹکراؤ تھا۔ اسلام کا ایک تصور یہ تھا کہ حکومت کسی قسم کی بھی ہو، اس میں اسلام پر عمل ہو سکتا ہے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ اس کے لئے الگ آزاد مملکت کا قیام لاینفک ہے۔ جس میں حکومت قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان مذہب پرست جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان کے لئے ایک قطعۂ زمین حاصل ہو گیا۔ یہ ان کی شکست تھی لیکن انہوں نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کے لئے مختلف تدابیر سوچیں۔ (جیسا کہ پنڈت

تشکیل پاکستان کے بعد

جواہر لعل نہرو نے اعلان کیا تھا، ہندو حکومت کے یہ ارادے تھے کہ سیاسی اور عسکری سطح پر ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن سے مملکت پاکستان کا (خاکم بدہن) وجود ہی باقی نہ رہے۔ لیکن مذہب پرست جماعتوں نے یہ ارادہ کیا کہ یہ خدا داد مملکت قائم رہتی ہے تو رہے، لیکن اس میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام نافذ ہونے نہ پائے۔ اسلام وہی نافذ ہو جس کے علمبردار علماء حضرات ہیں۔ اس مقصد کے

حصول کے لئے ضروری تھا کہ یہ تمام جماعتیں پاکستان آجائیں اور یہاں اپنے تصور کے نفاذ کی کوشش کریں۔ چنانچہ تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی یہ سب ہجوم کرکے ادھر آگئے۔ ہندوستان سے پاکستان کی طرف آنے والے مسلمان عوام بیچارے تو لاکھوں کی تعداد میں قتل ہوگئے۔ ان کے قافلے لوٹے گئے۔ ان کی عصمتیں برباد ہوگئیں۔ یہ تباہ اور برباد ہوگئے لیکن مذہب کے علمبردار حضرات امن و امان سے بحفاظت ادھر منتقل ہوگئے۔

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ حقیقی اسلام کے نفاذ سے ہندو ہی لرزاں و ترساں نہیں تھا۔ مغرب کی سرمایہ پرست اور سیکولر نظام کی حامی اقوام بھی اس سے خائف تھیں۔ اس لئے ان کی بھی یہی کوشش تھی کہ اوّل تو پاکستان بنے ہی نہ، اور

اقوام مغرب کی طرف سے مخالفت

اگر یہ بن بھی جائے تو یہاں (اقبال اور جناح کے تصور کا) حقیقی اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اقبال نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس کی نگہ بصیرت نے اس خطرے کو بھی بھانپ لیا تھا۔ ان کی آخری تصنیف 'ارمغان حجاز' میں ایک نہایت شگفتہ اور بلیغ نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ اس میں انہوں نے بڑے دل کش محاکاتی (ڈرامائی) انداز میں ان اقوام کے اس خطرہ کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ انداز اس نظم کا یہ ہے کہ ابلیس اپنی کابینہ کی میٹنگ منعقد کرتا ہے جس میں ہر شعبہ کا مشیر اپنی اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کو ابلیسی راستوں پر ڈالنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ صدر مجلس، ابلیس، ان رپورٹوں کو بڑی توجہ سے سنتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ تم نے جن تحریکوں کو ابلیسی پروگرام کے راستے کی رکاوٹ بتایا ہے مجھے ان میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ ان کے برعکس ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

تم نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ کمیونزم میں ہمیں بڑا خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تمہاری نگاہ حوادثِ عالم کی سطح پر ہے۔ اور

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب ابلیس نے کہا تھا کہ اصل درحقیقت خطرہ اُمتِ مسلمہ سے ہے تو اس کے مشیروں میں کچھ چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ اس پر اس نے کہا کہ تمہارے دل میں جو شکوک ابھر رہے ہیں، مجھے ان کا احساس ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں | ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں | بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ سب جانتا ہوں:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر۔ کہیں

وہ شرعِ پیغمبر۔ یعنی قرآنی نظام، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہارے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات　　ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

انہوں نے کہا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہئے؟ اس نے کہا کہ یہ قوم بڑی مذہب پرست واقع ہوئی ہے، اس لئے اس سے مذہب کا چھڑا دینا مشکل ہے۔ قرآن ان کے ہر گھر میں ہوتا ہے۔ انہیں بھلے بندوں اس سے بیگانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لئے بڑے کچھ فریب حربہ کی ضرورت ہوگی، اور وہ یہ کہ ان میں نظری مسائل کی بحثیں چھیڑ دو۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے　　یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اور اس طرح:۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

پھر حسن رکھو کہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس خطرہ سے محفوظ و مامون رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے مراد صرف تصوف کی خانقاہیت نہیں۔ وہ مذہب بھی ہے جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔

علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دینے کے ساتھ ہی اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا جو اسے پیش آنے والا تھا۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری کی حامل اقوامِ مغرب (جنہیں بغرضِ تعارف امریکن بلاک کہا جاتا ہے) کی طرف سے ان کی مخالفت اس بلاک کی ابلیسیت کا یہ عالم ہے کہ خود ابلیس نے بحضور رب العزت درخواست کی تھی کہ مجھے اب ریٹائر کر دیجئے، کیونکہ

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست　　باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اس بلاک کے پیشِ نظر دو مقصد تھے۔ ایک کمیونزم کے سیلاب کی روک تھام۔ اور دوسرے پاکستان میں اس اسلامی نظام کو قائم نہ ہونے دینا جس کی خاطر اسے حاصل کیا گیا تھا اور جس میں اس بلاک کو اپنی موت نظر آتی تھی۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کو اپنا آلۂ کار بنانا ضروری تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

دنیا کے خدا پرستو! آؤ، ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں۔

جب ۱۹۷۶ء میں پاکستان میں سیرت کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈبلیو۔ منٹگمری۔ واٹ بھی شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ

> اس وقت نوعِ انسانی اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تاکہ عیسائی اور مسلمان اپنے مشترکہ دشمن "الحاد" کے خلاف مل کر جہاد کر سکیں۔ (نوائے وقت۔ لاہور۔ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۵۶ء)

اس "زیادہ سے زیادہ تبلیغ" کے لئے اس بلاک نے کیا کچھ کیا اس کے متعلق ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے جہاں فنڈامینٹلزم کی تحریک کا ذکر آئے گا۔ سردست آپ "الحاد و بے دینی کے خلاف جہاد" کو دیکھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ الحاد اور بے دینی کی مخالفت مسلمانوں کا فریضہ ہے لیکن قرآن تو روس کے انکارِ خدا اور اقوامِ مغرب کے اقرارِ خدا دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے۔ اور دونوں سے اُس خدا پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس میں فرق کیا اور روس کی لادینی کی مخالفت کو اپنا دینی فریضہ قرار دے لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ روس کی لادینی پر اس کا کچھ اثر پڑا ہو یا نہ) مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس قدر یہ جہاد زور پکڑتا گیا، مغربی بلاک کا نظامِ سرمایہ داری اس نسبت سے مستحکم ہوتا گیا۔ یہ اس بلاک کا پہلا مقصد تھا۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اس اسلام کا نفاذ نہ ہونے پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مذہبی جماعتوں کا تعاون ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں (کالعدم) جماعت اسلامی کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں تو اس قسم کی خبروں کو کسی نے چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھا لیکن اب جو ماضی کے ان واقعات پر نگاہِ بازگشت ڈالتے ہیں تو نظر آجاتا ہے کہ اس جماعت کے امریکی بلاک کے ساتھ شروع ہی سے روابط قائم تھے۔ (مثلاً) روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں یہ خبر درج تھی کہ

> امریکی سفارت خانہ کے پروفیسر ڈاکٹر وکیر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلبا کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت تھی۔ ان کے ساتھ جماعت اسلامی (لاہور) کے راہ نما بھی آئے تھے۔ اور مقامی امیر مولانا گلزار احمد تھے۔ (بحوالہ امروز۔ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۵۲ء)۔

یہ ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے۔ ۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا تو (مرحوم) مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں کہا:-

> اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں۔ . . . . مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت ۱۶ و ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

ظاہر ہے کہ اس بلاک کو مسلم عوام کا تعاون ان کے نمائندوں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔

ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ روابط قائم ہوئے یا نہیں۔ اور اگر قائم ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ یہاں اس

قسم کی جو پیشگوئیاں ہوتی رہیں کہ امریکہ کی طرف سے یہاں کی مذہبی جماعتوں کو مالی امداد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ (اس زمانہ کی) نیشنل عوامی پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری محی الدین احمد صاحب نے ڈھاکہ کے ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ جماعت اسلامی کو سی۔ آئی۔ اے کی طرف سے حال ہی میں ساٹھ لاکھ روپیہ ملا ہے۔ اور اس سے پہلے وہ غارت کمیپ تیار کرانے کے بہانے ... پچیس لاکھ روپیہ ہضم کر گئی ہے۔ (بحوالہ روزنامہ امروز۔ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۶۹ء) ۔ اسی سلسلہ میں مؤقر ہفتہ وار چٹان لاہور نے اپنی ۱۵ مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:۔

"غیر ملکی حکومت سے گفتگو کرنے اور اس کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا حق صرف اس ملک کی حکومت کو ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کی کوئی جماعت اپنے طور پر یہ اقدام کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی نہیں بلکہ کسی اور ملک کی گماشتہ ہے۔

(۱)

اسلام نافذ کرو کا نعرہ

ہم اس سوال کے سیاسی گوشے سے قطع نظر کرتے ہوئے، اس گوشے کی طرف آتے ہیں کہ جن مذہبی جماعتوں نے مطالبہ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی انہوں نے یہاں "اسلام نافذ کرنے" کے سلسلہ میں کیا کیا۔ انہوں نے یہاں آتے ہی یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس لئے یہاں سب سے پہلا کام اسلام کے نفاذ کا ہونا چاہیئے۔ اور یہ کام ہم ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ آپ یہاں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ وہ اسلام جس کا تصور اقبال اور قائد اعظم نے پیش کیا تھا، یا وہ اسلام جسے آپ پیش کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے وہی اسلام نافذ کرنا تھا، جسے یہ وہاں پیش کرتے تھے اور جس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ انہوں نے جب اپنے مطالبہ پر زیادہ زور دیا تو اعتراض یہ ہوا کہ آپ میں تو اس قدر فرقے ہیں جن میں اس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے! اگر آپ کوئی متفق علیہ فارمولا متعین کر سکیں تو اس باب میں پیش رفت ہو سکے۔ اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے سنہ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے نمائندگان پر مشتمل (۳۱) علماء کی کانفرنس منعقد کی جس میں قانون سازی کے سلسلہ میں حسب ذیل فارمولا پیش کیا گیا:۔

(۱) پرسنل لاز ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ اور

(۲) ملک کے قوانین 'کتاب و سنت' کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔

یہ بہت بڑا مقدس فریب تھا جو قوم کو دیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ملکی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب ہو ہی نہ سکے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی معنی خیز ہے۔ جہاں تک 'کتاب' کا تعلق ہے، اس سے مراد قرآن مجید ہے جو سب فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ لیکن 'سنت' کی یہ کیفیت نہیں۔ یہی نہیں کہ ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے۔ سنت کسے کہتے ہیں، اس میں بھی ان کا اختلاف ہے۔ اور شدید اختلاف۔ کانفرنس میں پاس کردہ فارمولا (کتاب و سنت) پر دستخط کرنے والوں میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی (مرحوم) صدر مرکزی جماعت اہلِ حدیث، سرفہرست تھے۔ 'سنت' کی (DEFINITION) کے متعلق ان میں جو بحث چلی، وہ

مولانا مرحوم کی طرف سے شائع کردہ کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث" میں بالتفصیل درج ہے۔ اس کے نمایاں اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک جن کے نمائندہ مولانا سلفی (مرحوم) تھے۔ صحیح احادیث میں جو کچھ آیا ہے، وہ سب کا سب سنّت ہے۔ اس کے برعکس، مودودی صاحب (مرحوم) کے نزدیک:۔

مودودی صاحب کے نزدیک

سنّت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق اور امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنّت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جنکو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی بنا پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے، اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنّت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ص۲۱۳ و ص۲۱۴)

اسی کتاب میں وہ ص۱۴۳ پر لکھتے ہیں:۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنّت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور نہ شرائعِ الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنّت بنا دیں۔ سنّت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنّت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنّت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنّتِ رسول اللہ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنّت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنّت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنّت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً ص۲۱۴)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں :-

جو امور آپ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سُنّت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اُس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا ۔ یہ دین میں تحریف ہے ۔ (ایضاً ۔ ص ۳۳)

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ احادیث کے مجموعوں میں تو اس کی تصریح کہیں درج نہیں کہ حضورؐ نے فلاں بات بہ حیثیت رسولؐ فرمائی (یا کی) تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے ۔ تو (مودودی صاحب کے اصول کے مطابق) سُنّت کو متعین کیسے کیا جائے گا ۔ اسے کون متعین کرے گا اور اس کے سُنّت ہونے کی سند کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا ۔ اس کا فیصلہ وہ شخص کر سکتا ہے :-

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے ..... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ..... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا ۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا ۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے ۔ اس لئے کہ اس کی نظر اُس ناؤ بیقر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے ۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے ۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے ۔ وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی ۔ (تفہیمات ۔ حصہ اول ۔ ص ۳۰۲ تا ص ۳۲۴)

مولانا اسماعیل (مرحوم) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا :-

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصوّر کر لے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے جسے چاہے رَدّ کر دے، یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوےٰ کر دے کہ میں نے اس میں ہیرے کی جوت دیکھ لی ہے ۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے ۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سُنّتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے ۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث ۔ ص ۳۶)

ظاہر ہے کہ جب سُنّت کی (DEFINITION) میں اختلاف کا یہ عالم ہے ۔ تو سُنّت کا وہ مجموعہ کہاں سے مل سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سُنّت تسلیم کرتے ہوں! ان حالات میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ ۱۹۵۱ء میں (۳۱) علماء نے جو متفق علیہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ ملکی قوانین کتاب و سُنّت کے مطابق مرتب ہوں، وہ کہاں تک قابلِ عمل تھا؟ اس کے باوجود یہ حضرات (مودودی مرحوم سمیت) بیس سال تک یہ مطالبہ پیش کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں ۔ تا آنکہ ۱۹۷۱ء میں (خود مودودی (مرحوم) کو اعلان کرنا پڑا :-

کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں۔ شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان "ایشیا"۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال ابھرا ہوگا کہ جب مودودی (مرحوم) نے محسوس کیا کہ یہ سنّت کے پیدا کردہ اختلافات ہیں جن کی وجہ سے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، تو انہوں نے تجویز کیا ہوگا۔ کہ قانون سازی کا مدار قرآن کو قرار دے دیا جائے کیونکہ اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں، لیکن توبہ کیجئے، وہ ایسا کس طرح کر سکتے تھے؟ قرآن کے تو نام سے ان حضرات کو چڑ ہے کیونکہ اس سے ان کا رچایا ہوا سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن کے نام سے کس قدر چڑ ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ دو سال اُدھر کی بات ہے، سعودی عرب نے اپنے ہاں ایک نیا دستور رائج کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، (کالعدم) جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیا نے اپنی ۱۳ اپریل ۱۹۸۸ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:-

> ایک اور بات کی جانب بھی ہم توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ خبر ہے کہ شہزادہ نائف نے کہا ہے کہ سعودی عرب کا آئین قرآن کریم ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے منقطع نہیں ہے۔ لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کا جو بھی دستور بنے اس میں کتاب کے ساتھ سنّت کا لفظ ضرور موجود ہو۔

مقصد اس سے یہی تھا کہ اسلامی مملکت کی جس اسکیم کو ہم یہاں ناکام بنا چکے ہیں۔ وہ کہیں سعودی عرب میں کامیاب نہ ہو جائے۔

بہر حال جب مودودی (مرحوم) نے کہا کہ کتاب و سنّت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ یہی وہ فقہ جس کے متعلق ان کے اپنے نظریات یہ تھے:-

۱- مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء۔ ص ۳۲۶)

۲- یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔ (ایضاً)

۳- بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جا سکتے ہیں اور نہ سب کے سب دریا بُرد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردّوبدل کیا جا سکتا ہے۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۸۲)

۴- دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۱ھ)

۵- میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میں ان کے بیانات

سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ دوم۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۶۱)

۶۔ میں مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں، اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۹۱ء ایڈیشن ص ۲۳۴)

۷۔ میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (ایضاً ص ۲۴۴)

۸۔ ایک صاحبِ عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔۔۔۔ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ (تنقیحات۔ پانچواں ایڈیشن۔ صفحہ ۱۵۱)

۹۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (ایضاً۔ ص ۱۷۲)

فقہ کے متعلق مودودی صاحب کے ان نظریات کے ساتھ ان کے اس مطالبہ کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

فقہ حنفی کو حنفی (سُنّی) فرقہ کے سوا کوئی فرقہ بھی من وعن اسلامی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب سے عدم دلچسپی کی انتہا ہے کہ جب مودودی (مرحوم) نے یہ تجویز کیا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے، تو کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ آپ نے کتاب و سنّت کے فارمولا کو اس لئے مسترد قرار دے دیا تھا کہ اس کی رُو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں، تو جو ضابطہ قوانین فقہ حنفی کے مطابق مرتب ہوگا، کیا اُسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں گے؟ کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا، حتیٰ کہ ان مذہبی فرقوں نے بھی، جو چھوٹے چھوٹے (فروعی) مسائل کے اختلاف پر حنفیوں سے اُلجھتے رہتے ہیں اور ان کے اختلافی جھگڑے پولیس اور عدالتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ خود حکومت نے بھی اس سوال کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور فقہ حنفی کو قانون سازی کا مدار تسلیم کر لیا۔ اس بے اعتنائی کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ جب زکوٰۃ سے متعلق قانون پبلک لا کی حیثیت سے نافذ کیا گیا تو شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف ایسا شدید عملی احتجاج ہوا کہ حکومت کو یہ قانون بدلنا پڑا اور ہر فرقہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ (قرآنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی البتہ اجازت نہیں دی گئی)۔ یہ حشر ہوا پہلے ہی پبلک لا کا۔ جہاں تک سزاؤں (حدود) سے متعلق نافذ کردہ قوانین کا تعلق ہے خود صدرِ مملکت نے ایک سے زیادہ بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے چند ہی روز بعد صدرِ مملکت نے امریکہ کی (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں (ان کے اس اعتراض کے جواب میں کہ یہ سزائیں بڑی وحشت ناک ہیں) کہا تھا کہ:

یہ ٹھیک ہے، لیکن میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام سزا کے بجائے تخویف پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ

ناممکن العمل

اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اُس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جا سکیں گی۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۹ر فروری ۱۹۷۹ء)

صدرِ مملکت نے، اواخر نومبر ۱۹۸۱ء میں ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے میگزین ایشیا ویک (ASIA WEEK) کو انٹرویو دیا جس میں انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں شرعی حدود کے متعلق قوانین تو نافذ کر دیئے گئے ہیں لیکن ان کے مطابق کسی کو سزا نہیں مل رہی۔ فرمایا کہ :-

یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کر سکتے۔ قرآنی قانون کا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہئے جو لوگوں کو ارتکابِ جُرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مل سکیں جو شہادت دیں کہ انہوں نے جنسی اختلاط کے وقت عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ایسا ناممکن (IMPOSSIBLE) ہے۔ (ایشیا ویک۔ بابت ۴ر دسمبر ۱۹۸۱ء)۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں اسلام کو کس طرح ایک عضوِ معطّل بنا کر رکھ دیا گیا ہے؟ اس کے باوجود چرچا کیا جا رہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ پاکستان کے مخالفین (اور اقبالؒ کی نگہ دُور رس کے مطابق) اقوامِ مغرب دونوں کا یہی منشاء تھا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کی نظامِ سرمایہ داری کی علمبردار قوتوں نے "خدا پرستوں" (یعنی مسلم اقوام) کو جو دعوتِ اتحاد و تعاون دی تھی تو اس سے کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا مقصود تھا۔ مودودی (مرحوم) نے اسی لئے ان سے کہا تھا کہ تمہارا یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ تم مسلم ممالک کے حکمرانوں کے بجائے یہاں کے عوام سے رابطہ قائم کرو۔ یہ رابطہ کس طرح قائم ہوا اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن

نظامِ سرمایہ داری

مودودی (مرحوم) نے اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا وہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابقِ اسلام ثابت کرنے کے لئے کس قدر کوشش کی۔ اس نظام کو انہوں نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں :-

۔ اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حدو نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زمینی جائیداد ہی وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے (مسئلہ ملکیتِ زمین پہلا ایڈیشن۔ ۱۹۵۰ء۔ صفحہ ۵۲-۵۳)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع

کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کرسکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دُنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً صفحہ ۴۳)

یہی نظام اس وقت یہاں رائج ہے جسے اسلامی کہنے کے لئے فقہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ دولت کا انبار در انبار جمع کرنا عین مطابقِ اسلام ہے بشرطیکہ اس میں سے چند پیسے بطور "زکوٰۃ" ادا کر دیئے جائیں۔ ربوٰ کا نام رہے (قرآن نے "خدا اور رسول" کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے) منافع رکھ دیا گیا ہے، خواہ وہ بینکوں میں جمع کردہ رقوم پر ہو اور خواہ کاروبار میں (SLEEPING PARTNER) کے طور پر جس کے لئے فقہ کی اصطلاح مضاربت اختیار کر لی گئی ہے۔ زمین پر بے حد و نہایت ملکیت جائز ہے بشرطیکہ اس سے "عُشر" ادا کر دیا جائے۔ اس قسم کے منافع کو مزارعت کہہ دیا گیا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کی وہ شدید شکل ہے جس میں اب خود نظام سرمایہ داری کی حامل اقوامِ مغرب بھی لچک پیدا کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں اسے اسلام کے معاشی نظام کے نام سے رائج اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ یہی اقوامِ مغرب کا منشا تھا۔

فنڈامینٹل ازم

ہندو پہاری مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب کی یہ تشکیلی سازش آہستہ آہستہ زمیں گیر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست تھی اور اقوامِ مغرب یہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں کہ ان کی یہ آہستہ خرامی رفتہ رفتہ جمود کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع شدہ "اسلام" کی شرابِ کہن کو نئی بوتلوں میں اس طرح بند کیا جائے کہ اصل اور نقل میں فرق نہ کیا جا سکے۔ اس نئی تحریک کا نام انہوں نے (FUNDA MENTALISM) رکھا جس کے لغوی معنی "بنیادی اسلام" کے ہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر عام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں ہی نہیں یورپ، امریکہ، کینیڈا تک میں جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں، اور وہاں کے نامور مذہبی پیشوا اور قدامت پسند پیشہ ور ان کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روپے کے سیلاب کے بند اس طرح کھول دیئے

ہیں کہ سب اس میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ جس اسلام کو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا لیکن اس کے لئے اسلوبِ بیان ماڈرن اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے ہمارا وہ طبقہ جو 'مولویوں' سے متنفر تھا ان کی باتیں کان لگا کر سنتا ہے، حالانکہ ان کی باتیں بھی وہی ہوتی ہیں جنہیں مولوی صاحبان پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ تحریک روپے کے زور اور پراپیگنڈہ کے شور سے کامیاب ہو رہی ہے۔ خواص کی نگاہوں میں 'ماڈرن ازم' کی چمک سے اس قدر خیرگی پیدا کی جا رہی ہے کہ ان میں حقیقت اور فریب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اور عوام کے لئے مذہب کی رسمی تقریبات کو اس قدر پُرکشش، بارونق اور مقدس بنایا جا رہا ہے کہ وہ ساحریت کے اس دامِ ہمرنگ زمین سے نکل ہی نہیں سکتے۔

یہی تھا وہ نظام جس کی ملکیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں 'شعبۂ اسلام' کے مشیر نے کہا تھا کہ

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام　　پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدّر میں سجود　　ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں　　ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج　　صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا؟　　کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

(ارمغانِ حجاز، صفحہ ۲۱۵-۲۱۶)

اور اس میں تحریکِ پاکستان کے مخالفین اور اقوامِ مغرب واقعی کامیاب ہیں۔

مقصدیت

یاد رکھئے! جس مملکت کے قیام کا تصور اقبالؒ نے دیا تھا اور جس کے لئے قائداعظمؒ کی سعیِ پیہم کے تصدق ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا، اسے اپنی مقصدیت کے اعتبار سے اسلامی مملکت بننا تھا۔ وہ مقصدیت یہ تھی کہ اس میں:-

(۱) حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوگا۔ حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔

(۲) اس میں غلط اور صحیح۔ جائز و ناجائز۔ اسلامی اور غیر اسلامی کی سند اور اتھارٹی قرآن مجید ہوگا۔

(۳) اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔ خوف ہوگا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت رساں نتائج کا جن کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوگا۔

(۴) اس میں نہ کوئی فرد رات کو بھوکا سو سکے گا۔ نہ کسی کی کوئی ضرورت رُکی رہے گی۔

(۵) اس میں امیر اور غریب۔ محتاج و غنی۔ حاکم و محکوم کی تمیز نہیں ہوگی۔ تمام انسان یکساں واجب التکریم ہوں گے اور تذلیل و توہینِ آدمیت سنگین ترین جرم ہوگا۔

(۶) اس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود۔ اُمت کے باہمی مشورہ سے نظامِ حکومت قائم ہوگا اور وہ نظام قرآن مجید میں متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قواعد و ضوابط خود مرتب کرے گا۔ انہی کو احکامِ شریعت کہا جائے گا۔

(۷) اس میں ساری اُمت، اُمتِ واحدہ ہوگی جس میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوگا۔

یہ تھا وہ نظام جسے قائم کرنے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے مخالفین کی انتہائی کوشش تھی کہ اوّل تو یہ خطۂ زمین ہی حاصل نہ ہو، اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس میں یہ نظام قائم نہ ہو سکے (جسے الدین کہا جاتا ہے)۔ اس کے بجائے اس مذہب کا دَور دورہ ہو جس سے انسان نہ دین کا رہتا ہے، نہ دُنیا کا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا تھا:۔

ہماری حفاظت، ہماری نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس عہد و جہاد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا۔ نہ اسلام کا نام و نشان۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۵)

اگر قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ پاکستان مل جانے کے بعد بھی اس اسلام پر کیا بیت رہی ہے جس کے احیاء کے لئے انہوں نے پاکستان لے کر دیا تھا۔

بہر حال، ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم اس میں ناکام رہ گئے اور پاکستان کے مخالفین کامیاب ہو گئے۔ یہ بدقسمتی ہماری ہی نہیں، پوری کی پوری انسانیت کی بدقسمتی ہے کیونکہ پاکستان نے اس نظام کی تجربہ گاہ بننا تھا جس سے نوعِ انسان نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا۔ اس اعتبار سے ہم اپنی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم ہیں اور عالمگیر انسانیت کی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم۔ ہزار سال کے بعد یہ نادرِ روزگار موقعہ ہمیں میسر آیا تھا، ہم نے اسے بُری طرح کھو دیا۔ اے وائے ما! اے وائے ما!!

جبیں را پیشِ غیر اللہ سُودیم
چو گبراں در حضورِ او سرودیم
ننالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم (ارمغانِ حجاز۔ صفحہ ۸)

مجھ سے اکثر تقاضا کیا جاتا ہے کہ میں اقبالؒ کے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی پیش کر دیا کروں۔ میں ان اشعار کا ترجمہ کیا کروں؟ یہ تو اپنی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا ماتم کرنا ہے۔ ہر چند کہ ماحول کی افسردگی طبیعت کو اس طرف آنے نہیں دیتی لیکن غالب نے اس مفہوم کو اپنے شوخ و شنگ انداز میں جس طرح ادا کیا ہے اس سے بات سمجھ میں آجائے گی۔ اس نے کہا ہے:۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے!
غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

جن رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار وہ اسلام تھا جس کے لئے ہمیں یہ خطۂ زمین عطا ہوا تھا اس اسلام کو نافذ کرنے والے انسان بھی اتنے ہی بلند اور عظیم ہونے چاہئیں تھے۔ ہمارے جیسے پست قامت ان بلندیوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تھے، اس لئے ہم اس نعمتِ کبریٰ کے اہل نہیں قرار پائے۔ جو تیشۂ فرہاد اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا ہو، اسے جوئے شیر کیسے مل سکتی ہے؟ ہمیں اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنی چاہئے تھی۔ قرآن کریم نے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (تم سب پر غالب آجاؤ گے) کے لئے اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (اگر تم مومن ہوتے) کی شرط عائد کی تھی۔ ہم نے اس شرط کو پورا نہ کیا تو اس مقام تک پہنچ نہ سکے۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ فرعون کی غلامی میں وہ ضعف و بیچارگی کی انتہا تک پہنچ گئے تو مشیتِ خداوندی نے ان کی حالت پہ رحم کھایا اور چاہا کہ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو جائے۔ (۲۸/۵)۔ اس کے لئے انہیں ایک خطۂ زمین عطا کر دیا گیا۔ (قرآن کے الفاظ میں) اسے ان کے نام لکھ دیا۔ (۵/۲۱)۔ لیکن جب وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو تقدیرِ امم کے اٹل قانون کی رو سے فیصلہ ہوا کہ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ (۵/۲۶)۔ جس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا گیا تھا اس سے انہیں محروم کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ وہ چالیس سال تک خانہ بدوشوں کی طرح صحرا نوردی کریں۔ اور اپنے اندر تمکن فی الارض کی صلاحیت پیدا کریں۔ خدا کرے کہ ہمارے جرائم کی سزا ابدی محرومی نہ ہو۔ وقتی ہو۔ اور جس طرح بنی اسرائیل کی اس نسل کے بعد آنے والے مورخ نے اسی سرزمین میں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کا نظارہ کیا تھا، ہمارا آنے والا مورخ بھی اس نظام کی جنت آفرینیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جس کے لئے یہ خطۂ زمین ہمیں عطا کیا گیا تھا۔ اُس کی رحمتِ بے پایاں نے، جنت سے نکلے ہوئے آدم کو جنت کی بازیابی کا وعدہ بھی تو دلایا تھا۔ لیکن یہ جنت مفت میں نہیں مل جاتی تھی۔ اس کے لئے فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ (۲/۳۸) کی شرط لازم تھی۔ اس طرح حاصل کردہ جنت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عمل تست، جناں چیزے ہست

ہمیں یہ خطۂ زمین ملا ہی اس لئے تھا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ٥ (۱۰/۱۴)۔ "ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟" ہم نے جس قسم کے کام کئے اُسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آ گیا۔ یہاں تو

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لیکن مجھے تو داستانِ بنی اسرائیل کو اپنے حال پہ منطبق کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ ان کی تمکن فی الارض سے عارضی محرومی کے بعد، نئی نسل کے نوجوان (حضرت) موسیٰؑ پہ ایمان لے آئے اور ان کے جوشِ کردار نے مخالفت کے ہر بند کو توڑ کر تمکن حاصل کر لیا۔ لیکن ہماری نئی نسل کو تو اس مقام پہ پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ اسلام کے نام تک سے متنفر ہو رہی ہے۔ اس کا اگلا قدم سیکولرزم ہوگا۔ اُس وقت بھارت کا ہندو۔ مسلمانوں کی وہ تمام جماعتیں جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اور اقوامِ مغرب اپنی اس کامیابی پہ جشنِ مسرت منائیں گی کہ

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اس سے اُن کے دل پہ کیا گذرے گی جنہوں نے اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کا خواب دیکھا تھا اس کی بابت مت پوچھئے۔

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

لیکن اس کے باوجود جب تک میرے دم میں دم ہے میں قرآن کی آواز بلند کئے جاؤں گا کہ میرے سامنے اُس کا یہ وعدہ موجود ہے جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، کہ اس نظام کو دُنیا کے ہر نظام پہ غالب آ کر رہنا ہے۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

حق اگر از پیشِ ما بردارد ش پیشِ قومے دیگرے بگذارد ش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند (جاوید نامہ صـ۱۹)

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ حیات قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کا نظام نہ کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے۔ نہ کسی خاص قوم تک محدود۔ اور نہ کسی خاص زمانے سے مختص۔ جو قوم جس ملک اور جس زمانے میں بھی اس کے حقائق پر علم و بصیرت اور تعقل و تفکر کی رو سے غور کر کے انہیں اختیار کر لے گی وہ اس سے فیض یاب ہو جائے گی۔ مذہب پرست قومیں، جو اپنی خوش فہمیوں میں مست اور توہم پرستیوں میں مطمئن رہتی ہیں ان کے حصے میں یہ سعادت نہیں آسکے گی۔ دانش ورانِ مغرب، اپنے موجودہ نظامِ حیات سے تنگ آکر ایک نئی دنیا اور اس میں ایک جدید نظام کی تلاش میں ہیں۔

ایک ایسی دنیا جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے۔ رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد ساری دنیا کی واحد حکومت ہوگی جو جمہوری طور پر تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے تذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

(BEYOND THE WELFARE STATE. BY. GUNNER MYRDAL)

یہ دنیا ایک ایسے مذہب کی رہینِ منت ہوگی۔

جو انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مجموعہ ہوگا۔ وہ عقل و فکر پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کیساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY; BY ERICH FROMM)

ہم نے اس مقام پر دانش ورانِ مغرب میں سے صرف دو ایک کے خیالات پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب اپنی نیشنلزم کے ہاتھوں نالاں ہیں کہ دنیا میں جنگوں کے لامتناہی سلسلہ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ وہ اپنے ہاں کی جمہوریت سے تنگ آچکے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بھی ملوکیت ہی کا پرتو ہے۔ مغربی سرمایہ پرست قومیں اپنے معاشی نظام کو عالمگیر تباہی کا موجب قرار دیتی ہیں۔ اس کے برعکس روس اور چین کی سوشلزم بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس حقیقت کے بعد جب وہ الا (مثبت نظام) کے متعلق سوچیں گے تو وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ اس طرح سے

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

والسلام

باب المراسلات

ایک دلِ دردمند کی صدائے جگر خراش

بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ۔ (۸۱/۹)

آخر کس جرم کی پاداش میں؟

پرویز صاحب! ابھی ابھی آپ کی مایۂ ناز تصنیف، کتاب التقدیر، ختم کر کے بیٹھا ہوں۔ آپ کے حق میں دل کی گہرائیوں سے ہزار ہزار دعائیں نکلتی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں! آپ نے میرے تحت الشعور میں پیوست ان پھانسوں کو نکال دیا جن کی وجہ سے میں اکثر، خود ذاتِ خداوندی کے متعلق، اقرار و انکار کی کش مکش میں گرفتار ہو جایا کرتا تھا۔ آپ نے مجھے از سرِ نو ایمان عطا کر دیا، اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان، جس سے میرے قلبِ مضطرب کو حقیقی اطمینان نصیب ہو گیا۔

بعض زخم ایسے ہوتے ہیں جو مندمل ہونے کے بعد جلد کو اس قدر نرم اور حساس چھوڑ جاتے ہیں کہ ذرا سی کرید بھی درد پیدا کر دیتی ہے۔ میں بچوں کے معاملہ میں بڑا حسّاس واقع ہوا ہوں —— ایسا حساس کہ کسی بچے کے رونے کی آواز، وہ کہیں سے آئے، مجھے اس طرح تڑپا دیتی ہے کہ میں راتوں کو سو نہیں سکتا —— آپ سوچئے کہ جس قلبِ حساس کی یہ کیفیت ہو، وہ ان ناکردہ گناہ معصوم بچوں کے درد و داغ اور سوز و گداز کو کس طرح برداشت کر سکتا ہے!

کے توانم دید، زاہد، جامِ صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند!

یہ ان بچوں کی سراپا درد حالت ہے جو مجھے خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ ذہنی طور پر تو اب میں، ان اسباب و علل کو سمجھتا ہوں جو ان کی اس کرب آمیز حالت کے ذمہ دار ہیں، لیکن بایں ہمہ اس سے میرے دل پر جو گذرتی ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کو اپنا شریکِ غم بنا لوں، کہ کسی غم خوار کی ہم نوائی، غم کی شدت میں کمی کر دینے کا موجب ہوتی ہے۔ جو کچھ میں عرض کرنے والا ہوں، وہ میری شنید نہیں، دید ہے۔ اور میری دید ہی کیا؟ ہمارے گرد و پیش اس قسم کی زندہ لاشیں جگہ جگہ ملیں گی بشرطیکہ

دیکھنے والے کی آنکھ اس تڑپ کو زندگی کی حرکت نہ سمجھ لے۔ مثال کے طور پر:-

(۱) بعض بچے پیدائشی اندھے، لنگڑے، لولے، اپاہج ہوتے ہیں۔ وہ ساری عمر، ان اسقام سے پیدا ہونے والے مصائب کا شکار رہتے ہیں، چونکہ اس کی کوئی توجیہہ اُن کی سمجھ میں نہ آئی اس لئے ہندوؤں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا ـــــ یا اپنی ذمہ داری سے منہ چرانے کا بہانہ تراش لیا کہ یہ ان کے پہلے جنم کے گناہوں کی پاداش میں ہے ـــــ لیکن یہ، عذرِ گناہ بدتر از گناہ' کی بیّن مثال ہے، یہ توجیہہ بے شک ناقابلِ تسلیم ہے۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ کوئی قابلِ اطمینان توجیہہ میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

(۲) آپ ہی کی مثال کے مطابق، کوٹھی کے کمرے اور اس سے ملحق نوکر کوارٹر میں، ایک ہی دن پیدا ہونے والے دو بچوں میں تفاوت ساری عمر رہتا ہے، اوّل الذکر، آسائشوں کی زندگی جیتا اور مرفرازیوں کے جھولے جھولتا ہے۔ دوسرا بے چارہ سوکھے ٹکڑوں پر گزارا کرتا ہے۔ پھٹا پرانا پہنتا ہے۔ زمین پر سوتا ہے۔ مالک کے بیٹے کی گالیاں سہتا اور مار تک برداشت کرتا ہے۔ بڑا ہونے پر اس کا ملازم ہو جاتا ہے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے۔ اس کی ساری عمر انہی تلخ کامیوں میں گذر جاتی ہے۔ آخر کس جرم کی پاداش میں؟

(۳) میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ پڑھے لکھے، سمجھدار، ملازم سرکار۔ بظاہر بڑے مہذّب۔ لیکن اس قدر زود رنج، مغلوب الغضب اور اس کے ساتھ ایسے تندخو، درشت مزاج اور سخت گیر کہ ذرا ذرا سی بات پر بچوں کو پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی چیخیں محلہ بھر کو کپکپا دیتی ہیں۔ وہ معصوم، کمزور و ناتواں، ایسے درندہ صفت باپ کا مقابلہ کرنا تو ایک طرف، اپنی مدافعت میں بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ بے سہارا ایسے ہیں کہ کہیں بھاگ بھی نہیں سکتے۔ اور اگر کبھی اس کی بیوی، بچوں کو چھڑانے کی کوشش کرتی ہے تو دو چار اس کے بھی رسید کر دیتا ہے۔ اڑوس پڑوس والیوں کے سامنے اس کی ایسی بے عزتی کر دیتا ہے کہ بے چاری کے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگ جاتے ہیں۔ میں ان بچوں کو دیکھتا ہوں۔ زرد رنگ، کملائے ہوئے۔ افسردہ خاطر۔ خاموش ـ سہمے سہمے۔ میں نے کبھی ان کے لبوں پہ تبسم یا چہرے پر ہنسی نہیں دیکھی۔ نہ ہی انہیں کبھی دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا ہے۔ اس وحشی انسان نما حیوان سے کبھی کہا جائے کہ وہ بچوں پر اس قدر ظلم نہ کیا کرے، تو وہ یہ کہہ کر منہ بند کر دیتا ہے کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی تربیت کیسے کی جا سکتی ہے ـــــ تربیت!!

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے گناہ بچے کس جرم کی پاداش میں ایسی سخت سزا بھگت رہے ہیں۔ مار پیٹ کی جسمانی سزا کے علاوہ، اس سے یہ جن نفسیاتی عوارض کا شکار ہوں گے وہ ان کی زندگیاں تباہ کر دیں گے۔ انہوں نے اس باپ کا انتخاب تو نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس گھر میں پیدا ہونے کے لئے درخواست تو نہیں دی تھی، پھر انہیں یہ سزا کیوں مل رہی ہے؟

(۴) یہ تو دو چار گھروں کی مثالیں ہیں۔ میرے مشاہدے میں متعدد دیگر گھر بھی ہیں جہاں ماں باپ کی ناخوش آئند طبائع، عادات اور روش سے بچے جہنّم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے ہمجولیوں کی نگاہوں میں اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نہ بچپن کی خوشیاں نصیب ہوتی ہیں، نہ انسانیت کا فخر میسّر۔

میں سوچتا ہوں کہ ان بچوں کا کیا قصور ہے کہ وہ اس قسم کے ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے؟

جو کچھ آپ نے کتاب التقدیر میں لکھا ہے، ذہنی طور پر تو میں اس سے مطمئن ہو گیا ہوں لیکن میں نامراد دل کی تسلّی کا کیا کروں؟ میں اب خدا کو تو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا لیکن اس سے ان بچوں کی بے بسی، بے کسی، بے چارگی اور کس مپرسی کا مداوا تو نہیں ہو جاتا! نہ ان بے خطا سزاؤں کی مدافعت جن کے وہ تختۂ مشق بنتے رہتے ہیں! میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ کیا ان بچوں کی درد بھری آہیں، اور حسرت بھری نگاہیں، ہمیں تباہی سے بچا لیں گی؟ حضرت عمرؓ کی زندگی کے آخری لمحات میں جب رفقاء نے انہیں جنت کی بشارت دی تھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے جنّت کی بشارتیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

اگر عمرؓ نے کسی پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔

کیا ہماری نمازیں اور روزے، ان معصوموں کی فریاد کی تلافی کر سکیں گے؟

—(۱)—

پرویز

محترمی! مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مسئلہ تقدیر کے متعلق میری قرآنی فکر کو آپ نے مفید پایا اور اس سے آپ کی بہت سی الجھنیں دور ہو گئیں۔ یہ میری شب بیداریوں اور دیدہ ریزیوں کا بہت بڑا صلہ ہے۔ باقی رہا شکریہ کا سوال، تو آپ کو جو کچھ ملا ہے وہ بارگاہِ قرآنی سے ملا ہے۔ میں تو اُسے آپ تک پہنچانے کا فقط ذریعہ ہوں۔ اس لئے شکریہ کی مستحق وہ بارگاہِ ذوالمنن ہے جس نے ایسا جیش بہا گنجِ گراں مایہ، ہماری سعی و کاوش کے بغیر ہمیں عطا کر دیا، اور وہ ذاتِ رسالتمآب جس نے بلا مزد و معاوضہ اسے ہماری طرف منتقل فرما دیا۔ وہ خدا کی رب العالمینی ہے اور یہ حضورؐ کی رحمۃ اللعالمینی! کس قدر خوش نصیب ہیں ہم بندگان فرومایہ!!

آپ نے کتاب التقدیر کا مطالعہ فرمایا۔ میں نے اس کے بعد ایک تشریحی مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا ——— التقدیر کی گرہیں ——— یہ طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا اگر آپ اسے بھی دیکھ لیتے، تو آپ کی مزید خلشیں دُور ہو جاتیں۔ میں نے اس میں بتایا ہے کہ (۱) انسانوں کے متعلق جن امور کو خُدا اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے، وہ انہیں بھی انسانوں کے ہاتھوں پورا کرتا ہے۔ اس کے

لئے صحیح نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور (۲) خدا نے جب انسان کو صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے تو وہ اس کے اختیار کو سلب نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کے معاملات میں دخل دینے لگے تو اس سے اس کا اختیار سلب ہو جائے۔ وہ ایسا نہیں کرتا۔ جو لوگ اپنی ذمہ داریوں سے جی چُراتے ہیں انہیں اسی قسم کا خدا پسند آتا ہے کہ وہ تو آرام سے بیٹھے رہیں اور خدا خود بخود ظالم کی کلائی مروڑ دے۔ وہ روز دیکھتے ہیں کہ خدا ایسا نہیں کرتا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو فریب دیئے رکھتے ہیں۔ دُور کیوں جایئے۔ حال ہی میں ہم نے (اسرائیل کی چیرہ دستیوں اور ستم رانیوں کے سلسلہ میں) خدا سے کہہ کہہ کر دیکھ لیا ہے۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کے برعکس، جو لوگ انسانی اختیار کی قدر و قیمت جانتے ہیں، وہ برملا کہہ دیتے ہیں کہ ؎

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
باین قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را (زبورِ عجم [illegible])

لہٰذا ہندوؤں کا ورنوں (انسانوں کی پیدائشی تقسیم) کا نظریہ ہو، یا ہمارے ہاں کا جبر (تقدیر) کا عقیدہ یہ سب اپنی ذمہ داریوں کو خدا کے سر تھوپنے کی خود فریبیوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے برعکس قرآن کا ارشاد ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (3/182)۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (16/118)۔ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ لہٰذا جہاں کہیں ظلم ہوتا نظر آئے، خواہ وہ بچوں پر ہو یا بڑوں پر، دیکھنا یہ چاہیئے کہ کون لوگ اس کے ذمہ دار ہیں۔

اب آیئے ظلم کی اِن مثالوں کی طرف جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔ سب سے پہلے پیدائشی تقسیم (اندھے۔ اپاہج) بچوں کو لیجئے۔ امراض کا تعلق طبیعی قوانینِ فطرت سے ہے۔ جن قوانین کے مطابق پیدائش کے بعد انسان مختلف امراض کا شکار ہوتے ہیں، انہی قوانین کی رُو سے جنین، رحمِ مادر میں، امراض میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کی روک تھام کے لئے مغربی ممالک میں بڑی جدوجہد ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جو جوڑا شادی کرنا چاہے اس کا طبّی معائنہ کر کے یہ اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی مرض ایسا نہیں جو وراثتاً منتقل ہو سکتا ہو۔ اگر کوئی ایسا مرض ہو تو وہ انہیں شادی کی اجازت نہیں دیتے، اور اگر اجازت دیتے ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ اولاد پیدا نہیں کریں گے۔

اس کے بعد وہاں رحمِ مادر ہی میں جنین کی دیکھ بھال شروع کر دی جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب وہاں بہت کم بچے پیدائشی امراض لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر پیدائش کے بعد اُن کی پرورش، نشوونما اور طبّی تحفظ کا نہایت اطمینان بخش انتظام ہوتا ہے۔ یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہوتی ہے، نہ کہ اُن افراد کی جن کے ہاں یہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے اب وہاں ایسے مناظر بہت کم سامنے آتے ہیں جن سے ہمارے جیسے حساس قلوب حلیم بیچ و تاب بنے اور اپنی بے بسی پر خون کے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا واعظ یہ کہہ کر عوام کو مسحور فریب رکھتا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے جس میں کوئی انسان دخل نہیں دے سکتا۔ یعنی اس خدا کی طرف سے جس نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

(۲) جہاں تک معاش کی رُو سے (کوٹھی اور لوکر گمری) طبقاتی تفریق کا تعلق ہے، یہ نظامِ سرمایہ داری

کی رُو سے رزق کی ناہموار تقسیم کا ثمرِ تلخ ہے۔ جیسے صدیوں کی اس تعلیم و تلقین نے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، وہ جسے جتنا چاہے دے، ایسے کیپسولوں میں لپٹا دیا ہے کہ اس کی کڑواہٹ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ اور غریبوں اور مفلسوں کی نگاہ اُن گوشوں کی طرف اُٹھ نہیں سکتی جو رزق کے خزانوں پہ سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔ انہیں یہ افیون اتنی مقدار میں پلائی جاتی ہے کہ آپ اور مَیں ان کی جس زبوں حالی پہ خون کے آنسو روتے ہیں انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ جنودِ ہامان کی ہی سحر کاریاں ہیں جو فرعونیت اور قارونیت کی بنیادوں کو مستحکم رکھتی ہیں اس کا علاج قرآنی نظام کے عصائے کلیمی کے سوا کچھ نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کو علیٰ حالہٖ رکھتے ہوئے معاشی اصلاح کی اسکیمیں، اس سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں کہ خیرات کے چند ٹکڑے ان گداگروں کی جھولی میں ڈال دیئے جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو انہیں صرف روٹی کی بھوک تھی۔ اس خیرات سے وہ غیرت و حمیت کے جوہر بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ حضورؐ نے اسی لئے خیرات کو "دل کی موت" قرار دیا تھا۔ میرے اور آپ کے آنسوؤں سے فرعونوں اور قارونوں کا دل پسیج نہیں سکتا۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ — دلِ شاہاں نسوزد بہرِ آں مرغے کہ در چنگ است (زبورِ عجم) اس باطل نظام کے اولین شکار بے شک غریبوں کے بچے ہوتے ہیں لیکن وہ غریب خود کب اس سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں؟ بچے اور بڑے سب اس جہنم کی آگ میں جھلستے زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۳) اب آیئے اُن گھرانوں کی طرف جنہیں بطور مثال آپ نے پیش فرمایا ہے۔ اس قسم کے والدین درحقیقت نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں اس قسم کے نفسیاتی مریضوں کا کوئی علاج ہی نہیں، حالانکہ شمار کیا جائے تو ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ملے گا جو کسی نہ کسی نوع سے نفسیاتی امراض کا شکار ہیں۔ مغربی ممالک جسمانی امراض کی طرح نفسیاتی امراض کے علاج کے لئے بھی بے حد کد و کاوش کر رہے ہیں۔ ان کی یہ مساعی ہنوز اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں، لیکن اتنے ہی سے وہاں کی فضا میں بڑی خوشگوار تبدیلی آگئی ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ وہاں قومی سطح پہ دوسرے قسم کے امراض در آئے ہیں) - ہمارے ہاں ابھی تک اس کی اہمیت کا احساس تک نہیں، حالانکہ قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (اُن کے "دل" میں روگ ہے) کہہ کر نفسیاتی امراض کی نشان دہی کی تھی جب کہ اُس زمانے میں سائیکالوجی کے امراض کی طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں گیا تھا۔ اور قرآن کو شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (دل کے امراض کا علاج) کہہ کر نفسیاتی امراض کے علاج کی طرف توجہ دلائی تھی، اور حتمی طور پہ کہہ دیا تھا کہ "جب تک تم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرو گے، تمہارے معاشرہ میں کوئی تبدیلی نہیں آسکے گی" (۱۳/۱۱)۔ لیکن ہمارے ہاں (دینی مسلمانوں کے مسالک میں) نفسیاتی تبدیلی کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔ یہاں، اوّل تو اصلاحِ احوال کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اور اگر کہیں ضرورت سمجھی جاتی ہے تو انسدادِ جرائم کے لئے تعزیرات اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے رسمی نمازوں اور بے کیف سجدوں کو کافی سمجھا جاتا ہے۔

اس مقام پہ میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نفسیاتی مریضوں کو یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دلا لینا چاہیئے کہ ان کے امراض کا علاج اجتماعی طور پہ ہی ممکن ہے۔ اس لئے جب تک معاشرہ کی طرف سے اس کا انتظام

نہ ہو، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔ وہ اپنے طور پر اپنی اصلاح کر نہیں سکتے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں قوتِ ارادی ودیعت کر دی ہے۔ اور اس قوت کے زور سے انفرادی طور پہ ان امراض کا علاج ممکن ہے۔ سائیکیٹرک بھی ان امراض کا علاج قوتِ ارادی ہی کو اُبھار کر کرتا ہے۔ قرآن نے جب ابلیس سے کہا تھا کہ تیرے حربے بے پناہ سہی، لیکن میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چل سکے گا، تو اس سے ان کی اس قوتِ ارادی کی ممکنات کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ قوتِ ارادی سے اگر قرآن کی راہ نمائی میں کام لیا جائے، تو انفرادی طور پہ بھی، نفسیاتی امراض کا علاج ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اجتماعی نظام میں یہ علاج نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ علاج ہی نہیں! قرآنی معاشرہ کی صحت مندانہ فضا میں ان امراض کے جراثیم نہ پرورش پا سکتے ہیں نہ غالب آسکتے۔ حضورؐ نے جب فرمایا تھا کہ "میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے"۔ تو اس سے یہی مراد تھی۔ لیکن ہمارے ہاں تو اس قسم کے مریض اپنے آپ کو مریض سمجھتے ہی نہیں۔ اور اگر کوئی انہیں مریض کہہ دے تو وہ اس کے گلے پڑ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد کس قدر حقیقت کُشا ہے کہ "انسان کس قدر احمق واقع ہوا ہے۔ اگر اس کا گدھا بیمار ہو جائے تو یہ اس کے علاج کے لئے مارا مارا پھرتا ہے۔ لیکن اگر اس کا نفس بیمار ہو جائے تو اس کے علاج کا خیال تک نہیں کرتا"۔ دوسری طرف ہماری حکومتوں کی طرف سے اس کا انتظام تو ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گدھے گھوڑے کو ایذا پہنچائے تو محکمۂ انسدادِ بے رحمی اسے گرفتار کر سکتا ہے۔ لیکن اس محکمہ کا دائرۂ کار "حیوانات" تک محدود ہے۔ انسان اُن کے حیطۂ اختیار میں نہیں آتے۔ اس لئے وہی شخص جو اپنے گدھے کو ایذا پہنچانے کے جرم میں ماخوذ کیا جا سکتا ہے، اپنے بال بچوں کو تنگ کرے تو اُس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ بیچارے اُس کے رحم و کرم پہ زندگی بسر کرتے اور زبانِ حال سے ہمیں کوستے رہتے ہیں۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ اصلاحِ معاشرہ کے مدعی بڑی بڑی سکیمیں بناتے ہیں، لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ معاشرہ کی اصلاح کا آغاز ان ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے والے مظلوم بچوں سے ہوگا۔

یہ ہے میرے محترم! معصوم بچوں کی حالتِ زار کے مداوا کی صورت۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، ان گھروں میں پیدا ہو جانے والے بدقسمت بچوں کی اذیتوں کا کوئی مداوا نہیں ہو سکے گا، اور دیدۂ یعقوبؑ کی طرح غم کے آنسو بہانا میرا، آپ کا "مقدر" رہے گا۔

آپ کے سوال کے پیشِ نظر میں نے اپنے آپ کو بچوں کی گھروں کی زندگی تک محدود رکھا ہے۔ ان پہ محلے کے سکولوں اور مساجد کے مکتبوں میں کیا گزرتی ہے، اسے زیرِ بحث نہیں لایا، حالاں کہ وہاں کی عقوبت گھر کے جیل خانوں سے بھی زیادہ انسانیت کُش ہوتی ہے۔

(۵)

تذکرۂ غوثیہ — پرویز صاحب کی گراں قدر اور پُر از معلومات تصنیف، تصوف کی حقیقت میں اولیاء کرام اور صوفیاء عظام کے احوال و کوائف اور کشف و کرامات سے متعلق عجیب روزگار واقعات درج ہیں۔

قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے "تذکرۂ غوثیہ" میں سے بعض "حقائق" تحریر فرمائے ہیں جو امید ہے قارئین کی معلومات میں اضافہ کا موجب ہوں گے۔ "تذکرۂ غوثیہ" حضرت سید غوث علی قلندرؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) کے ملفوظات پر مشتمل ہے

جنہیں سجادہ نشین و متولی درگاہ غوثیہ، مولوی سید گُل حسن صاحب نے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت غوث علی قلندرؒ کا شمار بلند پایہ اولیا کرام میں ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :-

ایک روز ارشاد ہوا کہ حضرت ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں دو شخص بارادۂ بیعت حاضر ہوئے اُن میں سے ایک کو فرمایا کہ کہو :-

لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ

اُس نے کہا کہ اجی لاحول ولا قوۃ الا باللہ —— آپ نے بھی یہی کلمہ پڑھا۔
اُس نے پوچھا آپ نے لاحول کیوں پڑھی۔ آپ نے استفسار کیا کہ تم نے کیوں پڑھی۔ بولا کہ میں نے تو اس واسطے پڑھی کہ ایسے بے شرع کے پاس مرید ہونے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم نے اس لئے پڑھی کہ ایسے جاہل سے راز کی بات کہہ دی۔ اسکے بعد دوسرے شخص کو بُلایا اور وہی فرمایا کہ کہو لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ۔ اُس نے جواب دیا کہ حضرت میں تو آپ کو کچھ اور ہی سمجھ کے آیا تھا۔ آپ تو درے ہی گر پڑے، رسالت ہی پر قناعت کی۔ آپ نے ہنس کر فرمایا اچھا تم کو تعلیم کریں گے :- (صفحہ ۲۹۲)

ایک روز ارشاد ہوا کہ کروڑوں میں کسی ایک کو فقر حاصل ہوتا ہے اور جب حاصل ہو گیا تو پھر کسی طور سے زائل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نقل ہے کہ

غوث بہاء الحق زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز بالاخانہ پر تشریف رکھتے تھے۔ زیر دیوار شور و غل مچا۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی کنوئیں میں گر پڑا ہے۔ آپ نے غرفہ میں سے ہاتھ بڑھا کر اس غریق کو تہ چاہ نکال کر باہر کھڑا کر دیا۔ ایک فقیر شکستہ حال بچہ مردانِ خدا میں سے تھا اُس طرف آ نکلا۔ کیفیت صدور کرامت ملاحظہ کی اور کہا کہ صاحب زادہ یہ تو بازیچۂ اطفال ہے۔ اگر سیکھنا ہے تو فقر سیکھو۔ آپ بالاخانہ سے اُترے اور فقیر صاحب سے جا ملے۔ پوچھا کہ فقر کیا چیز ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ صاحب زادہ فقر وہ شے ہے کہ نہ حرام سے جائے نہ زنا سے بگڑے نہ شراب سے خراب ہو نہ چوری سے زائل۔ کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا۔ وہ بے زوال اور پائیدار چیز ہے۔ آپ خاموش ہو کر چلے گئے اور خیال کیا کہ اس شخص کا امتحان کرنا چاہیے کہ اپنے کام میں پکا اور بات کا پورا ہے یا نہیں۔ اور اس کا قول مطابق فعل ہے یا صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ یہ سوچ کر ایک پلا کتے کا ذبح کیا اس کا تو پلاؤ دم کرایا اور اپنی کنیز کو لباس فاخرہ پہنا کر سکھا دیا کہ تو کچھ انکار نہ کرنا اور ایک بوتل شراب کی دی اور کہا کہ جا فلاں مقام پر ایک فقیر صاحب ہیں اُن سے کہو کہ یہ سامانِ دعوت آپ کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔ وہ تو جانتے ہی تھے کہ یہ امتحانی ضیافت ہے۔ پہلے تو شراب نوش کی پھر اس کنیز کی باچھیں دیکھیں۔ پھر پلاؤ چٹ کیا اور کہلا بھیجا کہ ان ڈھکوسلوں سے یہاں کیا ہوتا ہے۔ !؟
کنیز نے گھر جا کر ساری کیفیت بیان کی جب تو حیرت میں آئے۔ اگلے دن گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کی ملاقات کو چلے۔ راہ میں ایک ندی تھی۔ جب بیچ دھار میں پہنچے تو گھوڑے نے لید اور پیشاب کیا۔

اُس کنارے سے فقیر بہ آوازِ بلند پکارا کہ دیکھو صاحبزادہ کیوں دریا کو ناپاک کرتے ہو ۔۔۔ یہ بولے کہ واہ حضرت بھلا کہیں لید و پیشاب سے دریا ناپاک ہوتا ہے۔ شاید آپ مسائلِ فقہ سے بھی ناواقف ہیں۔ مردِ فقیر ہنسا اور کہا کہ سبحان اللہ، آپ بھی خوب فقیہہ ہیں کہ ذرا سی ندی تو لید و پیشاب سے گندی نہ ہو اور معرفتِ الٰہی کا بحرِ ناپیدا کنار جس کی ابتدا نہ انتہا پیچے کے پلاؤ اور شراب اور کنیزک سے ناپاک ہو جائے۔ حضرت بہاء الحق سمجھ گئے کہ حقیقت میں کشف اور کرامت اور چیز ہے اور فقر دوسری شے ہے ؎

فقر حق است و نہ حق از وے جدا
فقر لا محتاج باشد از خدا

از روئے ارادت فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ یہ پیچے اور چیزیں جو مدت العمر سے آپ کیا کرتے ہیں ان کو ترک کیجئے اور مردانِ خدا کا طریقہ اختیار فرمایئے۔ اتنی بات کہہ کر چل دیئے۔ پس فقیری کا حاصل کرنا اور فقیر بننا آسان بات نہیں ہے۔ بلکہ جب تک تمام مقاصدِ دین و دُنیا اور مراتب و مدارج اور کشف و کرامت کو ترک نہ کرے اور نامرادی و ناکامی کے میدان میں قدم نہ رکھے فقر کی ہوا بھی نہیں لگتی ؎

تا ایمان کفر و کفر ایمان نشود
یک بندۂ خاص حق مسلمان نشود (ص ۲۹۵-۲۹۶)

عرس

سوال: یہ جو آئے دن بزرگوں کے مزاروں پر عرس ہوتے ہیں، تو عرس کا مطلب کیا ہے؟

جواب: ہندو تصوف (ویدانت) کا عقیدہ ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اس دلدل سے نجات پا کر انسانی ذات کا اپنی اصل (ذاتِ خداوندی) سے مل جانا مُکتی (یعنی نجات) ہے۔ وہیں سے یہ عقیدہ ہمارے تصوف میں بھی آ گیا۔ چنانچہ آپ نے پوچھا اور سنا ہوگا کہ جب کوئی بزرگ وفات پا جاتا ہے تو یہ نہیں کہتے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ کہتے یہ ہیں کہ ان کا وصال ہو گیا۔ یا وہ واصل باحق ہو گئے یعنی ان کی ذات، ذاتِ خداوندی سے مل گئی۔

وصال اور وصل کے الفاظ عام ہیں۔ ان کا مفہوم بھی آپ کو معلوم ہوگا۔ یہیں سے عرس کا مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ عرس کے معنی ہیں شادی۔ شادیوں کے دعوت ناموں میں تقریبِ عروسی لکھا ہوتا ہے۔ لہٰذا جس دن کسی بزرگ کی وفات ہوتی ہے، اس لحاظ سے "وصال" ہو جاتا ہے۔ یہی ان کی تقریبِ عروسی ہے جس کی یاد ہر سال (اسی تاریخ کو) منائی جاتی ہے۔ عیسائیوں کی راہبات (NUNS) ساری عمر شادی نہیں کرتیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی شادی خدائے مسیح کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس جہت سے انھیں عروسِ مسیح (SPOUSES OF CHRIST) کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی (مثلاً) لال شہباز قلندر کے ملنگ ناک میں نتھ اور گلے میں گانی پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کی دلہنیں ہیں۔ "وارث شاہی دلہنیں" بھی زعفرانی جوڑا پہنتے ہیں۔

یہ ہے عرس کا مفہوم: ان امور کی تفصیل پرویز صاحب کی کتاب "تصوف کی حقیقت" میں ملے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثالی مملکت

(IDEAL STATE)

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اُس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آجتک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے، دور سے بھی، اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں، اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیّا کرنے کا ذریعہ ہے اور ارباب حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن جب حکومت ہاتھ آجاتی ہے تو اس پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ عہدِ قدیم کے کسی سیاستدان یا مفکر کے نہیں، جو اس نتیجہ پر اُس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اُسے اُن نظامہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اس کے سامنے، بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک ماہر سیاست (H. J. MENCKEN) کے ہیں۔ جنہیں اس نے اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT & WRONG) میں عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ اس میں مغرب کا وہ جمہوری نظام بھی شامل ہے۔

جو اس وقت تک کی فکر انسانی کی آخری ایجاد ہے، اور جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے (یا بڑا ناز تھا) اس سب سے آخری نظام کے متعلق پروفیسر جینکن لکھتا ہے۔

> ان مختلف اسالیب حکومت میں، سب سے زیادہ ناکام، نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل وعقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، یہ لوگ، ان عناصر کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، لامتناہی عرصہ تک برسر اقتدار رہتے ہیں۔

مغرب کے جمہوری نظام کی ناکامی کی اصلی وجہ کیا ہے، اس کے متعلق ہم بعد میں دیکھیں گے۔ سردست، صرف اتنا دیکھئے کہ مؤرخین اور مفکرین کی رائے یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے پانچ چھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر اسالیب حکومت وضع کئے ہیں۔ ان میں ایک بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ سب ناکام رہے ہیں۔ میں نے "مؤرخین اور مفکرین" اس لئے کہا ہے کہ انسان نے سابقہ نظامہائے حکومت کے ناکام تجارب کے بعد جس جمہوری نظام کو اختیار کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں یورپ کے قریب قریب تمام ارباب فکر ونظر تنگ آچکے ہیں، اور اس کی بجائے کسی بہتر نظام کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہے ہیں (تفصیل ان امور کی میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی)

سوال یہ ہے کہ انسان نے اتنے طول طویل عرصہ میں، اس قدر مختلف اور متنوع تجربے کئے۔ تو اس کی کیا وجہ تھی کہ ان میں کوئی تجربہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ سب ناکام رہ گئے۔

ناکامی کی وجہ کیا ہے؟

انسان کی اس مایوس کن ناکامی کے اسباب و وجوہات کی تفصیل میں جائیں تو نہ معلوم داستان کس قدر طویل ہو جائے، لیکن اسے اگر چند لفظوں میں سمیٹنا چاہیں تو اس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ سامنے آئے گی کہ انسان نے جو نظام حکومت بھی وضع کیا، اس میں حکومت کا اختیار و اقتدار، انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مختلف زمانوں میں حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں، لیکن روح ہر پیکر میں یہی کارفرما رہی۔ وہ قدیم ترین زمانہ کا قبائلی نظام تھا۔ یا بعد کا شہنشاہی نظام۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے سہاروں پر قائم شدہ، خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل نظام تھا، یا خدا کو حدود مملکت سے باہر نکال کر سیکولر انداز کا نظام۔ وہ عصر حاضر کا ڈکٹیٹرشپ کا نظام تھا یا انسانی ذہن کی آخری تصلیف، جمہوری نظام۔ ان سب میں ایک ہی حقیقت کارفرما رہی اور کارفرما ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں حکومت کا اقتدار، انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت۔ اُس نے قوت بازو سے سلطنت حاصل کی ہو یا وہ لوگوں کا منتخب کردہ ہو۔ اس کا نتیجہ آلڈوس ہکسلے کے الفاظ میں یہ کہ:

> تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کے لئے کوئی وجہ موجود نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آرہا ہے وہ آج نہیں ہوگا یا آئندہ بھی ایسا ہی نہیں ہوتا رہے گا۔
>
> (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE)

"تشکیل انسانیت" کا مصنف (برقو) اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

نشۂ اقتدار کی بدمستیاں

یہ بیماری لازمی اور لا علاج ہے۔ ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، جب اقتدار ہاتھ میں آجائے تو اس کے مہلک اثرات سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ نشۂ اقتدار وہ بلا ہے جس سے انسانی قلب کی ہر حرکت الٹی ہو جاتی ہے۔ ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ ہر نقطہ نگاہ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر فیصلہ میں ذاتی رجحانات کی رنگ آمیزی ہو جاتی ہے۔ ہر معاملہ میں تعصب دخیل ہو جاتا ہے۔ تمام ذہنی سکتے، فریب کے ٹکسال میں ڈھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پُر فریب اقتدار دل و دماغ پر مستولی ہو جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہمارا حکیم مشرق ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں	سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے !	صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے	عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

"اسکندر و چنگیز" کی طرف اشارہ کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ انسانیت کی یہ تباہیاں، صرف شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آئی ہیں۔ جمہوری حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام	جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب	تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

سوال شخصی اور جمہوری حکومت کا نہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت، عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے۔ اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے...... یہ انکشاف آج کا نہیں، بہت قدیم ہے کہ اقتدار مطلق، بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوت، انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مطلق قوت، اسے بالکلیہ خراب کر دیتی ہے...... نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو، اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی۔ دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی۔ دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے...... اور ان سب میں، سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے زور پر، اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔ (برفو۔ تشکیل انسانیت)

کمیونزم

یورپ کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے خلاف کمیونزم نے آواز بلند کی تھی اور دنیا کے مزدوروں کو پکار کر کہا تھا کہ اس لعنت کے خلاف متحدہ طور پر محاذ قائم کرو۔ اس میں سوائے تمہاری زنجیروں کے ٹوٹ جانے کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جور و استبداد کے ستائے ہوئے انسانوں نے، اس آواز کو نوید مسیحا

سمجھا اور اس آئین کو گلے سے لگایا۔ لیکن تجربے نے جلد ہی بتا دیا کہ کمزوروں کو آزادی اس سے بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

لارڈ اسنل اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ

حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو نوع انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔

(THE NEW WORLD)

اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ کوئی قابل اطمینان نظام حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن برٹرانڈ رسل اسے انسان کی بدفطرتی پر محمول نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی نظریہ کو دہراتا ہے کہ:

قوت بہر حال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیداد گری ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہر شخص فطرۃً بد واقع ہوا ہے بلکہ اس لئے کہ قوت کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنے پانچ چھ ہزار سال کے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب تک اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں رہے گا (خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کی جماعت) دنیا میں اطمینان بخش نظام تمدن و مملکت قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایسے نظام کے قیام کے لئے اولین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اور اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ جس نتیجے پر انسان اتنے طویل المیعاد تجربات، اور اس قدر جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کے بعد پہنچا ہے۔ جس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے اسے اس قدر خون کے دریا بہانے اور آگ کی خندقیں پیرنی پڑیں۔ جس کے لئے انسانیت صدیوں تک تڑپتی، پھڑکتی، کٹتی، جھلستی اور ذبح ہوتی رہی۔ کیا یہ آواز اس سے پہلے بھی کہیں سے سنائی دی تھی، اور اگر سنائی دی تھی تو اس نے کیا نتیجہ پیدا کیا تھا؟ ہاں! یہ آواز، آج سے قریب ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کی سرزمین میں جہاں اس سے پہلے علم و بصیرت کی کرن تک کا گزر نہیں ہوا تھا۔

زبان وحی کا اعلان

ایک صحرا نشین کی زبان سے بلند ہوئی تھی جس نے وحی خداوندی کے الفاظ میں، ساری دنیا کو للکار کر کہا تھا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس حق میں کسی کو شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم کائنات کی ساری مخلوق میں، انسان کا مقام

سب سے اونچا ہوں۔ جب انسان اس حق خداوندی میں شریک نہیں تو اس کے بعد، اس میں اور کون شریک ہو سکتا ہے۔

برگساں نے کہا تھا کہ

حکمت کا اقتدار اعلیٰ، انسانوں پر نہیں بلکہ اشیاء پر ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ ہو۔

(THE TWO SOURCES OF MORALITY & RELIGION)

جہاں تک اشیائے کائنات پر اقتدار کا تعلق ہے، زبان وحی نے انسانوں سے کہہ دیا کہ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا نے سب کو، اپنے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ تاکہ انسان، ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ آدم کے سامنے ملائکہ کے سجدہ ریز ہونے سے مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان، کائنات کی ہر قوت کو مسخر کر سکتا ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات پر انسان کا کلی اقتدار ہے۔ لیکن جہاں تک خود انسانوں کا تعلق ہے خدا نے کائنات سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ ..... (۳/۷۸)۔ کسی انسان کے شایان شان نہیں کہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین۔ ان قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار، اور نبوت تک بھی دیدے تو وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کی محکومی کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو"۔

لیکن انسانوں پر نہیں

اسے پھر سُن لیجئے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ دنیاوی حکومت کی مسندوں پر براجمان ہو جانے والے تو ایک طرف رہے کسی نبی کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔ وہ یہی کہے گا کہ اِنِّي عَبْدُ اللَّهِ (۱۹/۳۰) میں خود خدا کا محکوم ہوں۔ اس لئے مجھے حقِ حکومت کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

برادرانِ عزیز! غور کیجئے۔ اس سے بڑا انقلابی اعلان، کائنات کی فضاؤں میں کہیں اور بھی سنا گیا ہے؟ وہ اعلان جس نے اس تصور کو یکسر باطل قرار دے دیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اس اعلانِ عظیم نے، انسانوں کے خود ساختہ الوہیاتی حکومت و سطوت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا اور غلامی اور محکومی کی ان تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ جن میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) خواہ یہ زنجیریں، دنیاوی حکمرانوں کے تغلب و تسلط نے انسانوں کی گردن میں ڈال رکھی ہوں، اور خواہ مذہبی پیشوائیت نے تقدس و عقیدت کے ہاتھوں، انہیں لوگوں کے دل و دماغ کے گرد لپیٹ رکھا ہو۔ اس زلزلہ انگیز اعلانِ حریت نے ان تمام زنجیروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور انسان کو دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔

خدا کی حکومت سے مفہوم

یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ خدا کی حکومت سے مفہوم کیا ہے؟ خدا نہ کسی کے سامنے آتا ہے۔ نہ اس کا تختِ حکومت کہیں بچھا ہوا نظر آتا ہے

نہ اُسے کسی نے کوئی حکم دیتے دیکھا ہے نہ اُس کی آواز سُنی ہے۔ پھر اُس کی حکومت کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس سے مراد انسانوں کا، خدا کے نام پر حکومت کرنا ہے؟ کیا اس سے مطلب یہ ہے کہ بعض انسانوں کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اگر یہی مطلب ہے تو، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ اس سے بڑھ کر انسانی استبداد اور سخت گیری کی مثال کسی اور اندازِ حکومت میں نہیں ملے گی؟ انسان نے جس قدر، خدا کا نام لے کر، دوسرے انسانوں کو ستایا ہے، شیطان کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اور تماشہ یہ کہ نمرود و فرعون اور ہلاکو اور چنگیز نے اگر انسانوں پر مظالم روا رکھے تو دنیا آجتک ان کا نام لعنت اور پھٹکار سے لیتی ہے لیکن جن "مقدسین" کے طائفہ نے ان سے کہیں زیادہ انسانیت کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے، ان کے مجسمے پرستش گاہوں میں نصب کئے گئے۔ لہٰذا خدا کی حکومت سے یہ مفہوم تو ہو نہیں سکتا۔ وہ قرآن جو کسی نبی تک کو انسانوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیتا۔ عام انسانوں کو اختیاراتِ خداوندی استعمال کرنے کا حق کیسے دے گا؟

آپ دیکھیے کہ انسانی اقتدار و اختیار سے مراد کیا ہے؟ انسان دوسرے انسانوں پر کس طرح حکومت کرتا ہے؟

انسانی اقتدار سے مراد

آپ عہدِ قدیم کے بے آئینی کے دور کو چھوڑیئے جب ایک انسان محض قوت کے زور پر، دوسرے انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ حکومت "قانون" کے ذریعے ہوتی ہے جس انسان، یا انسانوں کی جماعت کو، قانون سازی کا حق ہوتا ہے، زمامِ اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ جماعت جو کچھ کرنا چاہتی ہے پہلے اس کے لئے ایک قانون وضع کر لیتی ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر قدم، قانون کے مطابق (LEGAL) ہو جاتا ہے اور ہر حرکت، آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پا جاتی ہے۔ اس کا نام انسانوں کی ڈکشنری میں "مہذب طرزِ حکومت" یا عادلانہ اندازِ مملکت ہے۔ لیکن، اگر الفاظ کے ان حسین و جمیل پردوں کو ہٹا کر، اصل حقیقت کو دیکھیں تو، آلڈوس ہکسلے کے الفاظ ہیں۔

> اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس یہ فرق نظر آئے گا کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

(ENDS AND MEANS)

قانون سازی کا حق

قرآن، قانون سازی کا حق کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو نہیں دیتا۔ وہ قانون کے سرچشمہ اور ماخذ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳/۳۹)۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جس قدر قوانین و ضوابط کی ضرورت تھی، ان کے اصول و حدود، خدا نے متعین کر دیئے۔ جن میں تغیر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (۶/۱۱۵) اب انسانوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصولی قوانین کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کا فیصلہ کرتے جائیں۔ خدا نے یہ قوانین، قرآنِ کریم کے اندر منضبط و محفوظ کر دیئے اور اس کے بعد ایک طرف تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) ان کے معاملات کے فیصلے انہی قوانین کی روشنی میں کرتے جاؤ اور دوسری طرف یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔

جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے جو خدا نے نازل کیا ہے انہیں کا فر کہا جائے گا۔ (۵/۴۴)

ان اصولی قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ان اقدار کو نافذ کرنے کے لئے عملی تدابیر سوچے اور ذرائع و وسائل بہم پہنچائے اس کا حقِ قانون سازی، صرف اس حد تک محدود ہو گا۔ یہی وہ بنیادی اصولِ مملکت ہے جس کے متعلق پروفیسر جوڈ نے کہا تھا کہ:

اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

مادّی اقدار۔ قرآن جب مملکت کو مستقل اقدار کے تحفظ کا ذریعہ بتاتا ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ محض اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کا تحفظ چاہتا ہے، اور مادّی اقدار (MATERIAL VALUES) سے اُسے کچھ سروکار نہیں۔ وہ نظامِ مملکت کو مادی اقدار کے تحفظ کا بھی ضامن قرار دیتا ہے، اس لئے کہ، انسان کی موجودہ سطحِ زندگی پر، اخلاقی اقدار، مادّی ذرائع ہی سے بروئے کار آتی ہیں۔ اسی لئے قرآن (SOUND MIND IN A SOUND BODY) — توانا جسم میں توانا قلب — کے اصول کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے مملکت، خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے اور افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) تمہیں اور تمہاری اولاد کو سامانِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ جب تک مملکت اس فریضۂ خداوندی کو ادا کرتی رہتی ہے، وہ خدا کی حفاظت میں رہتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل ہو جاتی ہے، خدا کی ذمہ داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی اس حالت میں صبح کرے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو، تو اس بستی کے رہنے والوں سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اور اسی عظیم ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ "اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔" "بنیادی ضروریاتِ زندگی" میں روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج سب کچھ آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے۔ اس لئے کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے فرائض میں یہ بھی کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱)۔ وہ سامان نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ وہ لوگوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تدابیر کرتے ہیں۔ پروفیسر بیکن نے کہا تھا کہ نظری طور پر مملکت، افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن نے اس سے بہت پہلے کہہ

دیا تھا کہ نظری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر، مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے، اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے سامان و ذرائع بہم پہنچائے۔

یہ مملکت، اس سامانِ پرورش اور اسبابِ نشو و نما کو صرف اپنے شہریوں تک محدود نہیں رکھے گی۔ یہ اس کی

تمام انسانوں کی پرورش

ابتدا اپنے ہاں سے کرے گی لیکن اس کے بعد اس دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے گی۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کے احکام و قوانین کو جاری و ساری کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے جو ربّ العلمین اور ربّ الناس ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان کا پرورش کرنے والا۔ اس لئے یہ مملکت، اس باب میں، انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرے گی۔ اس ضمن میں قوم، ملک، رنگ، نسل، زبان حتیٰ کہ مذہب تک کا اختلاف بھی، کوئی تفریق پیدا نہیں کرے گا۔ اس کے لئے بس "انسان" ہونا کافی ہوگا۔ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی قوم کا فرد ہو، کسی نسل سے متعلق ہو، کوئی زبان بولتا ہو۔ اور اس کا مذہب بھی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مملکت ان سب سے یکساں سلوک کرے گی۔ صرف "یکساں سلوک" ہی نہیں، بلکہ ان سب کی یکساں عزت کرے گی۔ اس لئے کہ وہ مستقل اقدار جن کے تحفظ کے لئے اس مملکت کی تشکیل ہوتی ہے۔

تکریمِ آدمیت

ان میں بنیادی حیثیت اس "قدر" کو حاصل ہے کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) خدا نے تمام انسانوں کو محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ہر انسانی بچہ۔ پیدائش کے اعتبار سے یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اس عزت و تکریم کے لئے اس آدمی کا آزاد ہونا کافی ہے۔ آدمیت احترامِ آدمی ؛۔

اس مملکت کا منشور ہوگا۔

نیشنلزم

ہمارے زمانے میں، انسانی تباہی کا سب سے بڑا سبب، نیشنلزم کا مغربی تصور ہے جس نے انسانوں کی برادری کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں کہ ایک انسان، دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ انسان کی اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ وہ نقشے پر ایک لکیر کھینچ لیتا ہے اور پھر اس لکیر کے دوسری طرف بسنے والے، اپنے ہی جیسے انسانوں سے شدید نفرت اور سخت عداوت اول میں پیدا کر لیتا ہے۔ ہمارے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ:

> مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ انسانوں کی مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔

(FREDRICK HERTZ — NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS)

یہی وہ نیشنلزم ہے جو برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں:

> نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے اور اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(THE HOPE FOR A CHANGING WORLD)

اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ تہذیب کے آذر نے جس قدر صنم ترشوائے ہیں،

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبالؒ نے یہ بات، وحی کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں کہی تھی۔ یورپ کے مفکر، پچاس سال کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفرقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔
>
> (A. HUXLEY — THE PERENNIAL PHILOSOPHY)

اسی لئے تو ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مغرب کے تصورِ قومیت کے مقابلہ میں یہ "قومیتِ اسلام" کیا ہے جس کی طرف اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے وہ اسے سمجھ لینے سے قرآن کی پیش کردہ مثالی مملکت کا واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳)

انسانوں کی عالمگیر برادری

تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس لئے وہی نظامِ تمدن صحیح اور کامیاب ہو سکتا ہے جو پوری انسانیت کو ایک قوم تصور کر کے قائم کیا جائے۔ جب تک انسان، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹا رہے گا، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یورپ نے نیشنلزم کی تباہیوں کا علاج، انٹرنیشنلزم میں سوچا لیکن اتنے مختصر سے عرصہ کے تجربے نے ہی یہ حقیقت اس پر واشگاف کر دی کہ اس مصیبت کا یہ حل بھی نہیں۔ اس لئے کہ

> جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل عالمگیر انسانیت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے۔
>
> (EMERY REVES — THE ANATOMY OF PEACE)

انسان کے تمدنی مسائل کا یہ وہ حل ہے جسے زبانِ وحی نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے پیش کیا تھا۔ انسانی ذہن نے اسے اُس وقت نہ اپنایا، لیکن اب صدیوں تک آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بالآخر وہ اس حل کی طرف آ رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو مثالی مملکت ان خطوط کے مطابق متشکل کی جائے گی اس کی ابتدا کسی ایک خطۂ زمین سے ہو گی۔ یہ

مثالی مملکت کی تجربہ گاہ

خطۂ زمین اس عظیم و عالمگیر انقلابی نظریہ کی تجربہ گاہ بنے گا۔ اس خطۂ زمین کی حفاظت نہایت ضروری ہوگی۔ اس لئے کہ اگر لیبارٹری ہی محفوظ نہیں رہے گی تو تجربہ کہاں ہوگا؟ اس مثالی مملکت میں وطن کی یہ حیثیت ہوتی ہے، اور اس اعتبار سے اس کا مستحکم اور محفوظ رکھنا افرادِ وطن کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔ وطن وہ صدف ہے جس میں جوہرِ انسانیت، گوہر آبدار بنتا ہے۔ اس لئے گوہر کی پرورش اور نشوونما کے لئے صدف کی حفاظت اور استحکام ضروری ہے۔ وطن ہی نہیں، بلکہ ساری طبیعی زندگی اور مادی اسباب و وسائل وہ مرکب (VEHICLE) ہیں جن پر سوار ہو کر جوہرِ انسانیت اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ جو مسافر اپنی سواری کی پرواہ اور حفاظت نہیں کرتا، اس سے زیادہ احمق کون ہے۔ لیکن سواری بہرحال ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ (MEANS) ہوتی ہے (END) نہیں ہوتی۔

اب مجھے اس سوال کی طرف آنا چاہئے جو اس مقام پر آپ کے دل میں بار بار ابھر رہا ہے۔ یعنی اس سوال کی طرف کہ جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے، وہ تو فی الواقعہ مثالی (IDEAL) ہیں، لیکن مملکت کا کاروبار بالآخر

مملکت انسانوں کے ہاتھوں سے عمل میں آئے گی

انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پائے گا۔ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ انسان ان اصولوں کو اچھی طرح چلائیں گے اور انہیں (ABUSE) نہیں کریں گے جہاں تک محض اصولوں کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جس کے آئین و ضوابط میں کوئی نہ کوئی اچھا اصول نہ ہو۔ ان سب کے ہاں اچھے اچھے اصول، آئینی ضابطوں میں درج ہیں لیکن انسانی ہاتھوں سے ان اصولوں کی جو درگت بنتی ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن اس مشکل کا کیا حل تجویز کرتا ہے؟ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے، لہٰذا اس کا جواب بھی، اسی نسبت سے غور طلب اور محتاجِ توجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ دنیا کی مختلف مملکتوں میں، باوجودیکہ ان کے آئین و ضوابط میں بلند پایہ اصول مندرج ہیں، اس قدر فساد کیوں برپا ہے۔ مختلف اقوام میں، باوجودیکہ ان میں بین الاقوامی معاہدات، اور عالمی اداروں کی بلند آہنگ قراردادیں موجود ہیں، باہمی بے اعتمادی اور تخریب کوشی کیوں ہے؟ پھر کسی ایک ملک یا قوم میں نہایت عمدہ ضوابط قوانین و ہدایات کے باوجود ارباب اقتدار ان کی پاسداری، اور عام افرادِ مملکت، قانون کا احترام کیوں نہیں کرتے؟

(SPALDING) ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب:- (CIVILISATION IN EAST & WEST) میں لکھتا ہے۔

مادی تصورِ حیات

موجودہ یورپ، دنیا کو "مادی انجیل" کا سبق دیتا ہے جس سے زندگی کے متعلق وہ تصور پیدا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ انسانی امن کے بجائے درندوں کی جنگ ہے۔ یہ عالمگیر شورش اور عدمِ اطمینان اسی تصور کا نتیجہ ہے۔ تہذیبِ مغرب کے لئے (اور اس کے ساتھ دوسری تمام تہاذیب کے لئے جو اس کی نقل کرتی ہیں) خطرہ کا موجب حکومت کی کوئی خاص شکل نہیں۔ اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ ان کی ہر حکومت خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے جب تک یہ بنیاد نہیں بدلتی؛ شکلوں کے بدل دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ یہ "مادی تصورِ حیات" کیا ہے جو عالمگیر فساد کی جڑ، قومی تباہ کاریوں کا موجب اور انفرادی خرابیوں کا باعث ہے۔ اس تصورِ حیات کی تفصیل تو لمبی ہے، لیکن اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی عبارت ہے اس کے جسم سے جو

طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے خاتمے سے اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ انسان کی زندگی اس کے ماوراء کچھ اور ہے، اور نہ ہی اس کے اوپر کوئی اور قوت ہے۔

اس تصورِ حیات کا جو اثر زندگی کے اور شعبوں پر پڑتا ہے، سردست اُسے چھوڑیئے۔ اس وقت صرف یہ دیکھئے کہ جہاں تک انسان کی تمدنی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالیں اس حقیقت کو واضح کر دیں گی۔

قانون سازی کے اختیارات

(۱) خواہ خلیفہ جیسا آمرِ مطلق ہو یا اس کی حکومت جیسا جمہوری ادارہ، دونوں میں قانون سازی کے اختیارات لامحدود ہوں گے جیکولر گورنمنٹ کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے۔ وہ، نہ کسی غیر متبدل اصول کی پابند ہو، نہ کسی ناقابلِ تغیر اخلاقی شرائط سے مشروط۔ وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنائے اور جب جی چاہے اس میں ترمیم کر دے یا اسے منسوخ ہی کر دے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں، ہر مملکت ایسے قوانین مرتب کرے گی جو اس مملکت کے لئے فائدہ مند ہوں۔ اسے باقی دنیا میں بسنے والے انسانوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا (ROMELIN) نے ٹھیک کہا تھا کہ

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔

ان حالات میں جو بین الاقوامی فساد برپا ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

(۲) حکومت میں جو پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی، وہ ایسے قوانین بنائے گی جن سے اُس جماعت کے مفادات کا تحفظ ہو سکے جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے۔ خواہ دوسری پارٹیوں کے مفاد پر اس کی زد کیسی ہی کیوں نہ پڑے۔ جب اس کی جگہ دوسری پارٹی برسرِ حکومت آئے گی تو وہ پہلی پارٹی کے وضع کردہ قوانین کو منسوخ کر دے گی اور ایسے جدید قوانین مرتب کرے گی، جن سے ان کی پارٹی کے مفاد کا تحفظ ہو۔ اس سے خود ملک کے اندر مختلف جماعتوں اور طبقات میں جس قدر فساد برپا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قانون کی پابندی

(۳) اس تصورِ حیات کے تحت، ملک کے قانون کی پابندی صرف وہ شخص کرے گا جسے اس کا احساس ہو کہ قانون کی خلاف ورزی سے:

(الف) وہ سوسائٹی میں بدنام ہو جائے گا۔

(ب) پولیس کی گرفت میں آ جائے گا۔ اور

(ج) عدالت اسے سزا دے دے گی۔

اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ خلاف ورزیٔ قانون سے پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے، اور اگر وہ پکڑا بھی جائے تو عدالت سے چھوٹ جائے۔ نیز معاشرہ میں وہ ایسا با اثر ہو کہ کوئی شخص اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکے۔ یا معاشرہ میں جرائم اس قدر عام ہو جائیں کہ جرم کا ارتکاب باعثِ ذلت ہی نہ سمجھا جائے، تو اس کے بعد کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں رہے گا جس کے تحت، قانون کی پابندی یا اس کا احترام باقی رہ سکے۔ چنانچہ آج کل تمام مہذب ممالک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر جگہ جرائم بڑھتے جاتے ہیں، اور جرائم کے انسداد کا علاج، اسباب نظم و نسق کی سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی کثرت اور پولیس کے اضافہ کی رفتار میں مسلسل دوڑ (RACE) جاری

رہتی ہے۔ یہ تو کسی مملکت میں بھی ممکن نہیں کہ ہر شخص کے سر پر ایک سپاہی مسلط رہے۔ اس لئے جرائم کی روک تھام ناممکن ہو چکی ہے۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں کوئی مملکت بھی ایسی ہو سکتی ہے جس کا نظم و نسق صحیح خطوط پر قائم رہ سکے، اور کوئی پارٹی بھی ایسی ہو سکتی ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں آنے اور وہ اپنے فائدے کی نہ سوچے؟

یہ ہیں اُس مادی تصورِ حیات کے فطری نتائج جس پر تہذیبِ مغرب کی اساس و بنیاد ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کی رُو سے تصورِ حیات یہ ہے کہ

قرآنی تصورِ حیات

(الف) انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے۔ جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما، مقصدِ حیات ہے۔

(ب) جس طرح خارجی کائنات کے لئے خدا کے متعین کردہ قوانین از خود موجود ہیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ نہیں نہ ہی انسان ان میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ابدی اصول متعین ہیں جن میں کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔

(ج) خدا کے مقرر کردہ قوانین کی خلاف ورزی کی سزا کا انحصار اس پر نہیں کہ اگر جرم کرنے والے کو کوئی شخص دیکھ لے یا اُسے گرفتار کر لے، تو اُسے اس کی سزا ملے اور اگر ایسا نہ ہو، تو وہ سزا سے بچ جائے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ آگ میں اُنگلی ڈالنے سے اُنگلی جل جائے گی اور اس میں سخت تکلیف ہوگی۔ اس میں صورت یہ نہیں ——

قانونِ مکافات

کہ اگر کوئی شخص آپ کو آگ میں اُنگلی ڈالتے ہوئے دیکھ لے تو آپ کی اُنگلی جلے اور اس میں تکلیف ہو۔ اور اگر اسے کوئی دیکھنے نہ پائے تو آپ اس "جرم" کی سزا سے بچ جائیں۔ یہ سزا آپ کو بہر حال مل کر رہے گی، خواہ آپ اس کا ارتکاب پہاڑ کی چوٹی پر، یا زمین کے غار کے اندر، تنہائی میں بھی کیوں نہ کریں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

جس طرح طبیعی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کے جسم پر ہوتا ہے، اسی طرح، اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے انسان کی جسمانی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح حرام کا مال کھانے سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح آگ کے غلط استعمال سے ہاتھ جل جاتا ہے، اسی طرح اختیارات کے غلط استعمال سے انسانی ذات کی صلاحیتیں جھلس جاتی ہیں۔ اسے جہنم کا عذاب کہا جاتا ہے۔ جس طرح سنکھیا اپنا ہلاکت آفریں اثر کر کے رہتا ہے خواہ آپ اسے بند کمرے کے اندر، ایسے وقت میں کھائیں جب کہ آپ کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو، اسی طرح مالِ حرام اپنا تباہ کن اثر کر کے رہتا ہے خواہ اس کا کسی کو علم ہو سکے یا نہ۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۝ (۱۳/۱۰-۱۱)

اس کے لئے برابر ہے خواہ تم میں سے کوئی بات کو چھپائے یا اسے بلند آواز سے کہے۔ خواہ وہ رات کی تاریکیوں میں چھپ کرے یا دن کی روشنی میں چلے۔ اس کے آگے اور پیچھے ایسے پاسبان لگے ہوئے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر نقل و حرکت اور قول و عمل کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ریکارڈ کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ یہ ریکارڈ ہر

انسان کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ (۱۷/۱۳)

نگاہ کی خیانت

جہاں تک طبعی قوانین کا تعلق ہے، ان کا نقصان صرف اس وقت پہنچتا ہے جب ان کی خلاف ورزی عمل میں آجائے۔ آپ ہزار مرتبہ دل میں خیال کریں کہ جب آپ کے سامنے آگ آئے گی تو آپ اس میں کود جائیں گے۔ اس سے آپ کے جسم پر ذرا بھی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ کا جسم اس وقت جلے گا جب آپ عملاً آگ میں کود جائیں گے۔ لیکن جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے، ان کی خلاف ورزی کا نقصان ارادہ کرنے سے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ وہ ذرا اندر جائے اور آپ اس کا قلم اڑا لیں۔ آپ دیر تک اسی خیال میں بیٹھے رہتے ہیں لیکن (آپ کی بدقسمتی کہ) وہ اُٹھ کر اندر نہیں جاتا۔ آپ بالآخر تھک کر ناکام چلے آتے ہیں۔ آپ نے چوری نہیں کی۔ دنیا کا کوئی قانون آپ سے مواخذہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اخلاقی اقدار کے قانون کی رُو سے، آپ کی ذات کو اس ارادہ سے بھی سزا مل جائے گی۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے واقف ہوتا ہے۔

اپنے خلاف آپ شہادت

دنیاوی جرائم کی عدالت میں اگر مجرم کے خلاف شہادت یا ثبوت نہ ملے، تو وہ چھوٹ جاتا ہے لیکن اخلاقی اقدار کی عدالت میں، نہ کسی خارجی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے نہ باہر کے گواہ کی۔ وہاں ہر مجرم، اپنے خلاف خود گواہی دیتا اور ثبوت پیش کرتا ہے۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷/۱۴) آج تو تیری اپنی ذات تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ پھر جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے کے بعد، گورنر جنرل کی سفارش بھی آپ کو اس کے درد سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اور لاکھ روپے کی رشوت بھی آپ کو اس تکلیف سے بچا نہیں سکتی۔ نہ ہی کوئی دوسرا آپ کی جگہ وہ دُکھ بھگت سکتا ہے۔ اسی طرح مستقل اقدار کی خلاف ورزی کی سزا سے کسی صورت چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا
يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ (۲/۴۸)

اس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام آسکے گا۔ نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کچھ معاوضہ لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی اس کا کوئی حامی و ناصر ہوگا۔

ان لوگوں کے ہاتھ میں نظم و نسق

قرآن کی مثالی حکومت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جن کا خدا کے اس قانونِ مکافات پر پورا پورا یقین ہو، اس پر ان کا ایمان ہو جنہیں یقینِ محکم ہو کہ اقدارِ انسانیت کی خلاف ورزی سے ان کی ذات کا نقصان ہوگا اور یہ نقصان دنیاوی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جس طرح عام مملکت کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہ ہو۔ اسی طرح اس مثالی مملکت کا انتظام بھی ان لوگوں کو نہیں سونپا جاتا جنہیں اپنی ذات کے نفع نقصان کا خیال نہ ہو۔ ایسے لوگ اس کے اہل ہی تصور نہیں کئے جاتے۔ وہ اس کے لئے (DISQUALIFY) ہو جاتے ہیں۔

ایمان کسے کہتے ہیں

کہہ دیا جائے گا کہ کانسٹیٹیوشن کو تو اس قسم کا اقرار ہر شخص کر لیتا ہے لیکن ان باتوں کو عمل میں کوئی نہیں لاتا۔ اس لئے بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ اپنے ایمان کے مطابق عمل بھی کریں گے۔ اس کے لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ آپ آگ میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ اس لئے کہ آپ کو یقین ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے آپ کا ہاتھ جل جائے گا۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یہ ایمان طبیعی قوانین کے متعلق ہے۔ مستقل اقدار کے متعلق بھی جس کا ایمان اس قسم کا ہو، اسے ایمان والا کہا جائے گا۔ اس قسم کے ایمان کے بعد ممکن نہیں کہ انسان زبان سے کچھ کہے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ جو شخص جانتا ہے کہ سنکھیا مہلک ہو جاتا ہے اس کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ زبان سے تو سنکھیا کو مہلک کہے لیکن جب سنکھیا سامنے آئے تو اسے جھٹ سے نگل لے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بڑی سے بڑی رشوت بھی اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکے گی۔ مال و دولت کا عظیم نقصان بھی اسے اس کے لئے تیار نہیں کر سکے گا۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گا لیکن سنکھیا نہیں کھائے گا۔ اسے کہتے ہیں سنکھیا کی ہلاکت آفرینی پر ایمان۔ اس سے کم درجے کا اقرار، ایمان کہلاتا ہی نہیں۔ لہٰذا، کسی مومن کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایسے کام کے لئے آمادہ ہو جائے جس سے اس کی ذات کی ہلاکت ہوتی ہو۔

ایسے لوگ ہوں گے اس مثالی مملکت کے ارباب حل و عقد۔

دین کی بنیادوں پر مملکت

یہ بنیادیں جن پر اس مثالی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں، دین کے اجزا کہلاتے ہیں۔ جب مملکت دین کے تابع رہے تو نوعِ انسان کے لئے ابرِ رحمت ہوتی ہے۔ اور جب دین سے الگ ہو جائے تو تباہیوں کا موجب۔ طرزِ حکومت کے بدلنے سے اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ مثالی مملکت قائم ہوتی ہے مستقل اقدار کی بنیادوں پر، اور اس کی بقا کا راز، اس غیر متبدل ابدی اصول میں ہوتا ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

بقاء اسی نظام کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

انسانیت کے لئے نفع بخش

کسی خاص جماعت، خاص پارٹی، خاص گروہ، خاص ملک، خاص قوم کے لئے نفع بخش نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے نفع بخش۔ حتیٰ کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس مملکت کی نفع رسانیوں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ اس میں غیر مسلموں کی جان، مال، عزت، آبرو ہی کی حفاظت نہیں بلکہ ان کی پرستش گاہوں تک کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کے معاملات عدل و انصاف کی رو سے طے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکم کی تعمیل اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ

(سورۃ ۵/۸) ... کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے۔

پروفیسر (J.D. MABBOTT) نے کہا تھا کہ

اچھی حکومت اسے کہنا چاہئے جس میں تمام افراد کی حفاظت ہو۔ کسی کو کسی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔ باہمی معاملات میں خوشگواری ہو۔ اور افراد کے تنازعات کے فیصلے عدل کی رُو سے کئے جا سکیں۔

(THE STATE AND THE CITIZENS)

قرآنی تصور کے مطابق قائم شدہ مملکت، ان تمام شرائط پر پوری اترتی ہے۔ یہی وہ مملکت ہوتی ہے جس کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج سے دنیا اب بھی بے بہرہ ہے کہ ذہن انسانی کے تجویز کردہ نظام حکومت اور وحی کے خطوط پر متشکل مملکت میں کیا فرق ہوتا ہے — وہی فرق جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ مملکت

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر

ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

پرویز

سنہ ۱۹۶۲ء

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد ۱۰/ روپے

مکمل سیٹ - [illegible] روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن)، عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد ۲۰/- روپے

مکمل سیٹ مجلد ۶۰/- روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵/ گلبرگ ۲، لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

نویدِ جانفزا!

مطالبُ الفرقان کی پانچویں جلد بھی شائع ہوگئی

اَلحَمدُ لِلّٰہ!

اس میں سورۃ الانعام مکمل، اور سورۃ الاعراف کی آیات (۱-تا-۱۵۸) آگئی ہیں جو بیشتر مشتمل ہیں حضرات انبیاءؑ سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کی داستانوں پر۔ جو احباب سلسلہ "مطالبُ الفرقان" کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصُول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہے اس سے قرآنی حقائق کس طرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں"

یہ جلد اعلیٰ درجے کے سفید کاغذ کے (۴۶۰) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دل کش۔
قیمت فی جلد ۷۵/- روپے۔ محصول ڈاک چھ (۶/-) روپے

ملنے کا پتہ

(۱)۔ ادارہ طلوعِ اسلام — ۲۵/بی — گلبرگ ۲ لاہور

(۲)۔ مکتبۂ دین و دانش — چوک اردو بازار — لاہور